کلام تجھ لب کا

(دکن کے منتخب شعرا کی غزلوں کا انتخاب)

مرتب وناشر

ڈاکٹر غضنفر اقبال

© جملہ حقوق بحق مرتب محفوظ

نام کتاب	: کلام تجھ لب کا
نوعیت	: دکن کے منتخب شعرا کی غزلوں کا انتخاب
مرتب وناشر	: ڈاکٹر غضنفر اقبال
سرورق	: رؤف صادق
تزئین کار	: باسط فگار
اشاعت	: مارچ 2019ء
تعداد اشاعت	: 300
صفحات	: 136
قیمت	: 100روپے
برائے لائبریری	: 200روپے

Kalam Tujh Lab Ka

(Dakan Ke Muntakhab Shora Ki Ghazlon Ka Intikhab)

Compiled & Published by

Dr. Ghazanfar Iqbal

"SAIBAN" Zubair Colony, Hagarga Cross, Ring Road
GULBARGA - 585104, (Karnataka), INDIA
Cell:09945015964
email : ghazanfaronnet@gmail.com

1st Edition : March 2019, Copies : 300,
Pages : 136, Price Rs. 100/-
For Library Price Rs. 200/-
ISBN - 978-93-83239-88-7

انتساب

دکن دیس کے نام

نور کے ذرّوں سے قدرت نے بنائی یہ زمین
آئنہ ٹپکے دکن کی خاک گر پائے فشار
علامہ اقبالؔ

منطق و حکمت و معانی پر
مشتمل ہے کلام تجھ لب کا
ولیؔ اورنگ آبادی

آہنگ

آہنگِ شوق .... غضنفر اقبال 07

آہنگِ عدم

- احسن یوسف زئی 21
- راہی قریشی 25
- محمد یوسف عثمانی 29
- صابر فخرالدین 33
- قمر اقبال 37
- جاوید ناصر 41

آہنگِ مضراب

- مظہر محی الدین 45
- محسن جلگانوی 49
- شاہ حسین نہری 53
- عتیق اللہ 57
- احمد سوز 61
- صادق 65
- وحید واجد 69
- قطب سرشار 73
- فہیم احمد صدیقی 77
- رؤف خیر 81
- سلیمان خمار 85
- راہی فدائی 89
- حامد اکمل 93
- رؤف صادق 97
- نورالدین نور 101
- ساجد حمید 105
- حشمت فاتحہ خوانی 109
- سلیم محی الدین 113
- مقبول احمد مقبول 117
- اقبال خسرو قادری 121
- سردار سلیم 125
- واجد اختر صدیقی 129
- مجتبیٰ نجم 133

آہنگِ شوق

غضنفر اقبال

اُردو شاعری میں غزل کی ثروت مندی آئینہ پرداز معانی کا حکم رکھتی ہے۔ غزل غمِ دل کا افسانہ ہے، زندہ دل کی کہانی ہے۔غزل زندگی کی تفسیر ہے حیات کے پردے میں رونما ہونے والے منظروں کا آئینہ تعبیر ہے۔غزل میں سخنور اپنا دل نچوڑ دیتا ہے تب ہی چشم دل میں نظر پیدا ہوتی ہے۔غزل بانی، کارِ جہاں بینی کا رمز ہے۔ یہ ذوقِ سفر کے سوا کچھ اور نہیں ہے۔ سخنور اپنے عہد کا آفریدہ ہے۔زندگی کی ہمہ رنگی کو شاعر جذب کر لیتا ہے اور پھر اپنے خونِ جگر سے غزل کی نمود کرتا ہے۔غزل، آئینہ تصویر نما کا فن ہے۔

دکن تاریخ ہند میں تہذیب وتمدن اور شعر وادب کا بہت بڑا مخزن ہے۔ دکن دراصل دراوڑوں کا ملک کہلاتا ہے۔ بندھا چل پہاڑوں سے نیچے راس کماری تک کا خطہ دکن ہے۔ ہندوستان جنت نشان کا دکن وہ علاقہ ہے جو دریائے نربدا اور کوہ بندھاچل کے جنوب میں سطح مرتفع ہے۔غزل کی شروعات دکن سے ہی ہوئی۔ یہاں کے مسلم سلاطین نے اس کی پرورش کی۔ ولی اورنگ آبادی، اُردو شاعری میں شجر سایہ دار کی حیثیت رکھتے ہیں۔اس شجر نے غزل کو شش دانگ پھیلا دیا۔ ولی اورنگ آبادی کے سایے میں غزل نے اپنا ارتقائی سفر طئے کیا۔ ولی دکن میں غزل کا ارتقا بھی ہے اور انتہا بھی۔ ولی کی معرفت دکن شاعر خیز خطہ بن گیا۔ یہاں کے دو ادبی مراکز اورنگ آباد اور حیدرآباد اُردو شاعری میں دبستان کی حیثیت رکھتے ہیں کیوں کہ دکن کے مذکورہ مقامات میں اردو شاعری اور خاص طور سے غزل کی گہری اور گھنی روایت قائم ہے۔غزل کا ساڑھے تین سو برس کا سفر دیار دکن کا مرہون ہے۔غزل کے دامن کو دکن کی غزل نے قدیم اردو یعنی دکنی میں ہو یا جدید اُردو میں مالا مال کر دیا۔

عہد موجود کے دکن کے شعرا ولی کی غزل کا تسلسل ہیں۔ان کی غزل میں دکن دیس کی وہ خوشبو ہے جس سے اُردو غزل معطر اور مطہر ہو رہی ہے۔پیش نگاہ دکن کے سخنوروں کا انتخاب اُن غزل نگاروں کا ہے جو راقم التحریر کے پسندیدہ سخنوران ہیں۔کتاب میں دکن کے 29 شعرا انتخاب کا حصہ بنے ہیں۔29 شعراء کی 05 غزلوں کا انتخاب کرتے ہوئے اُن منتخب غزلوں سے راقم التحریر نے اپنے پسند کے پانچ اشعار کا انتخاب کیا ہے۔شعرا کی ترتیب اُن کے سال پیدائش کے لحاظ سے مرتب کی گئی ہے۔شعرا کی غزلوں سے اُن کی شاعری کا احاطہ کرتا ہوا شعر بطور دستخط نمایاں کیا گیا ہے۔پسند اور ناپسند کے پیمانے متعین نہیں کیے جاسکتے ہیں لیکن راقم التحریر کے اس انتخاب میں وہ شعرا ہیں جنھوں نے اعتبار کی منزلیں حاصل کر لی ہیں۔اپنے کلام بلاغت نظام سے شعبہ شاعری میں تازہ کاری، نیاپن، بانکپن اور رنگارنگی پیدا کی۔ یہ انتخاب سوز وساز کا وہ مرقع ہے جس میں چنیدہ شعرا کی گونج موجود ہے۔ زیرِ نظر انتخاب سے اُن سخنوران کو منظر عام پر لانا ہے جو گردش زمانے کی وجہ سے بے منظری میں چلے گئے تھے۔جن کے کلام میں دم خم روز روشن کی طرح منزہ ہے۔اُردو کے ناقدین اور مبصرین نے زیر بحث شاعروں پر توجہ نہیں کی جس کی وجہ سے اُن کو اور اُن کے کلام کو وہ مقام اور منصب نہیں مل سکا جس کا وہ استحقاق رکھتے ہیں۔ جب کہ ان کا آئینہ اظہار بابِ سخن کا وہ دریچہ ہے جس کا مضمون تازہ ہے جس کے مطالعے سے رنگِ امتیاز کا پتا چلتا ہے اور ارض دکن کے سخنورانِ اُردو کا صفحہ کھلتا ہے۔

✍ احسن یوسف زئی (4 فروری 1932، النّد ضلع گلبرگہ 6/ مارچ 1988 بیڑ)

تجربہ پسند شاعر گزرے ہیں، وہ کم عمری سے ہی شعر کہا کرتے تھے۔ان کے کلام میں استادانہ شان تھی۔احسن کی غزل آبِ رواں کے مانند بہتی چلی جاتی ہے کیوں کہ وہ خمیر خاک زندگی سے اُٹھی ہے اور شعبۂ غزل میں تہہ دریا بن چکی ہے۔ان کی غزل میں قدیم وجدید شعری لوازمات اور افکار موجود ہیں۔انھوں نے اپنی شاعری میں نئے تجربے کیے ہیں۔مگر یہ تجربے غزل کے دائرے میں رہ کر کیے گئے ہیں یعنی ان کی غزل اپنی روایت سے انحراف نہیں کرتی بلکہ روایت کے سلسلے کو آگے

بڑھاتی ہے۔احسن یوسف زئی کی غزل ایک مہذب اورعزت دارانسان سے روشناس کراتی ہے جو دل ودماغ کوایک ساتھ متاثر کرتی ہے۔احسن یوسف زئی کا ایک عہد میں دکن کی سرزمین پر طوطی بولتا تھا۔ وہ اپنی حین حیات میں قدر شناسی سے محروم رہے لیکن ان کے شعری سرمایہ پر، پروفیسر عتیق اللہ، ڈاکٹرعصمت جاوید، بشرنواز، پروفیسر راہی قریشی، پروفیسر شاہ حسین نہری، پروفیسر حمید سہروردی، سلیم شہزاد، پروفیسر خالد سعید اور رؤف صادق جیسے اہم اہل قلم نے لکھ کر دریا بہادیے ہیں۔ یہی بات احسن یوسف زئی کے لیے صحیح معنوں میں خراج ہے۔

✍ پروفیسر راہی قریشی (20/اگست 1934 ،اورنگ آباد، 02/جولائی 2009 حیدر آباد) کی غزل تخیل کی سطح پر کلاسیکی شعری روایت سے جڑی ہوئی ہے لیکن الفاظ کا انتخاب برتاؤ اور دروبست کا نیاپن فن پر ان کی دسترس کا لوہا منواتا ہے۔ان کی غزل نگاری باذوق قاری کے ذہن میں ہلکا سا ارتعاش پیدا کرتی ہے۔جس سے سحرانگیز کیفیت طاری ہوجاتی ہے۔ بے ہنگم نیا کہنے کی بجائے اچھا کہنے کی دھن نے انھیں غیر ضروری لوازماتِ شعری سے بچائے رکھا ہے اس لیے لفظ و معنی کی سطحوں پر بہت زیادہ توڑ پھوڑ سے اجتناب کرتے رہے ہیں۔

✍ اُستادِ محترم ڈاکٹر محمد یوسف عثمانی (29/ڈسمبر 1938 (لکھنؤ)......27/جون 2014 (ممبئی) تدفین اورنگ آباد) ایک تربیت یافتہ شاعر تھے۔ایک وراثت اُن کے ساتھ تھی۔ استادِ محترم کے والدِ قبلہ حضرت یعقوب عثمانی مرحوم اُستاد شاعر تھے۔انھوں نے اورنگ آباد کے شعرا کی شاعری کی اصلاح اعلیٰ اقدار پر کی تھی۔ڈاکٹر محمد یوسف عثمانی کا کلام لیل ونہار کا نوحہ ہی نہیں تھا بلکہ اُن کی شعریات میں زندگی کے کئی رنگ مضمر ہیں۔کلام میں معنی آفرینی کی کیفیت غالب ہے۔ان کی غزل روایت اور جدیدیت کا خوبصورت امتزاج ہے۔ روایتی لفظیات اور کلاسیکی شعریات سے خوب استفادہ کرتے ہیں لیکن شعر عصری حسیت کا آئینہ دار ہوتا ہے۔غالب

کی سی اعلیٰ ظرفی اور داغ کی سی چابک دستی ان کی غزل کو جہاں ذوداثر بناتی ہے وہیں رک کر سوچنے کی دعوت بھی دیتی ہے۔ہمارے ناقدین نے اُن کی شاعری کا جائزہ ہنوز نہیں لیا ہے مگر اس کے باوجود بھی استادِ محترم مطمئن رہے اور انھوں نے نام ونمود کی کبھی پروا نہیں کی اگرچہ اُن کی ادب میں قدر پیمائی کبھی بھی نہیں ہوئی۔وہ ستائش اور صلے سے ہمیشہ بے نیاز رہے۔راقم التحریر اپنے لیے اعزاز متصور کرتا ہے کہ استادِ محترم ڈاکٹر محمد یوسف عثمانی مرحوم کی جوتیاں سیدھی کرنے کا موقع ملا۔

✍ صابر فخرالدین (7/جولائی 1942 یادگیر، 28/مئی 2018ء یادگیر) اصلاح پسند ذہن رکھنے والے شاعر تھے۔وہ اخلاقی اقدار اور صالح فکر کی ترجمانی کرتے رہے۔انھوں نے جہاں غزل کی ایمائیت اور رمزیت پر بھرپور توجہ کی ہے وہیں انسانی صالح اقدار کے استحکام پر اصرار کیا ہے۔صابر فخرالدین کی غزل مہذب آدمی کے احتجاج اور انکار کا بہترین ثبوت فراہم کرتی ہے۔ان کی غزل میں روایت کے ساتھ جدید رجحان کی بھی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ بامقصد، بامعنی اور حکمت آموز باتیں صابر فخرالدین کی غزل کا حصہ ہیں۔

✍ قمر اقبال (2/فروری 1944 اورنگ آباد .... 18/جولائی 1988 اورنگ آباد) تازہ کار اسلوب کے شاعر تھے۔غنائی شاعری ان کے کلام کی خوبی ہے۔جس کے لیے وہ مترنم بحریں استعمال کرتے ہیں۔قمر اقبال کی غزل نہایت رواں اور چست ہوتی ہے۔ان کے اشعار عام فہم اور زودفہم ہوتے ہیں۔اسی لیے زبان زدِ عام وخاص ہوکر سرعت کے ساتھ ذہنوں میں محفوظ ہوگئے ہیں۔قمر اقبال مشکل سے مشکل مضمون کو بھی آسان ترین پیرائے میں پیش کرنے کا ہنر رکھتے ہیں۔یہی بات اُن کی غزل کی ادا ٹھہری۔

✍ جاوید ناصر (23/فروری 1949 اورنگ آباد .... 5/مارچ 2006 اورنگ

آباد) البیلے شاعر کا نام تھا جس نے اپنی ذہانت سے دکن کے علاقے کو متاثر کیا۔ وہ اپنی غزلوں میں جدید انسان کے قلبی شور کو ایسے لطیف انداز میں سناتے ہیں کہ باہر کی فضا پرسکون طاری ہوجاتا ہے۔ عہد کی بے کیفی اور بے حسی سے بے پرواجاوید ناصر شریف انسان کی طرح ہر خارجی واردات کا زہر پی جاتے ہیں لیکن سالم رہتے ہیں۔ ان کی غزل کے کئی اشعار اداسی کی تصویر بھی ہیں۔ جس سے شاعر کو جینے کا حوصلہ ملتا ہے۔ مگران کے لیے زندگی بے وفا رہی۔

مظہر محی الدین (25؍جنوری 1933 ہبلی) غزلیہ شاعری کا درخشندہ نام ہیں۔ انھوں نے اپنے مشاہدے اور تجربے کو اپنے تخلیقی فن کا روپ عطا کیا ہے۔ ان کے ہاں انفرادی احساسات وجذبات بھی ہیں اور اجتماعی بھی۔ شاعر جہاں تنہائی اور بے گانگی جیسے احساسات کو اپنی غزل میں پیش کرتا ہے۔ وہیں اپنے عہد کے اجتماعی حسیت کو بھی اپنے اشعار میں نمایاں کیا ہے۔ مظہر محی الدین کی غزل میں غمِ ذات اور غمِ عشق کے قصے بھی موجود ہیں۔ ان کے موضوعات طرزِ بیاں اور لہجہ کا تیکھا پن ان کے شاعرانہ مزاج کا عکاس ہے۔

ڈاکٹر محسن جلگانوی (15؍جون 1939ء جلگاؤں) کج کلاں شاعر ہیں۔ ان کے کلام کا پختہ پن، تازگی اور احساس جمال کا ایک خوبصورت بیان ہے۔ ان کے شعری محرکات گہرا سماجی شعور پیش کرتے ہیں۔ محسن جلگانوی کی غزلیہ شاعری کلاسیکی اسلوب کی بھی نمائندگی کرتی ہے ان کے شعری مزاج میں رنگا رنگی ہے جو دعوتِ فکر دیتی ہے۔

پروفیسر شاہ حسین نہری (2؍فروری 1941، اورنگ آباد) قادر الکلام شاعر ہیں۔ ان کی غزلیں اپنے پاکیزہ خیالات اور اصلاحی مقصدیت کے سبب ہر حساس قاری کو تیزی سے اپنی طرف متوجہ کرتی ہیں اور دیکھتے ہی دیکھتے اپنا گرویدہ بنادیتی ہیں۔ نہری صاحب نے غزل میں

نئے تجربے کیے ہیں۔ ان کی غزل کی قوافی بظاہر کھردرے محسوس ہوتی ہے اور ثقیل الفاظ بھی وہ استعمال کر جاتے ہیں کہ ریشم کی طرح ملائم اور کلیوں کی طرح سبک دکھائی دینے لگتے ہیں۔ شاہ حسین نہری کی غزل کے اشعار رواں، تاثیر لیے ہوئے دل پذیر ہوتے ہیں۔

پروفیسر عتیق اللہ (21؍جولائی 1942، اجین) جاگتے ذہن کے غزل نگار ہیں۔ دکن کی سرزمین کو اپنا وطنِ ثانی بنایا۔ دکن کے اہم مرکز اورنگ آباد سے انھوں نے 'جدیدیت اور اُردو نظم' کے زیرعنوان ڈاکٹریٹ کیا تھا اوران کی غزلوں کا اولین نقش 'ایک سوغزلیں' ادارہ پیکر حیدرآباد نے 1976 میں خوبصورت انداز سے شائع کیا تھا۔ اورنگ آباد دکن کو عتیق اللہ محبت آباد کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ ان کے کئی قریبی اقارب اسی شہر میں قیام پذیر ہیں۔ عتیق اللہ ہر تین ماہ میں اورنگ آباد آتے جاتے رہتے ہیں۔ گویا دہلی اور اورنگ آباد اُن کے لیے گھر آنگن ہے۔ 1970 سے عتیق اللہ نے اورنگ آباد کو وطن عزیز بنالیا ہے۔ عتیق اللہ کی غزل میں تجربوں سے فطری مناسبت کے سبب جو تازہ کاری پائی جاتی ہے۔ وہ غزل کے قاری کو مسرت آمیز استعجاب سے آشنا کراتی ہے۔ وہ غزل کی اندرونی ساخت سے چھیڑ چھاڑ کرتے رہتے ہیں۔ عتیق اللہ جذبے اور تخیل میں تصنع پیدا ہونے نہیں دیتے کہیں کہیں، عروضی تجربات کے باوجود اشعار کی روانی مجروح نہیں ہونے پاتی۔

احمد سوز (یکم فروری 1943، بنگلور) نئی سمتوں کا شعور رکھنے والے شاعر ہیں۔ وہ عموماً چھوٹی چھوٹی بحروں میں گہری گہری باتیں نظم کرنے کا ہنر رکھتے ہیں۔ قافیوں میں تجربے کرتے ہیں اور نئی نئی زمینیں نکالتے ہیں لیکن الفاظ اور تراکیب عام فہم، سادہ اور عام بول چال کی زبان سے اُٹھاتے ہیں۔ ان کے غزل کے اشعار کبھی تیکھے اور کبھی میٹھے ہوتے ہیں ان کی غزلیں صرف چکنے جیسی نہیں بلکہ نوالا نوالا اسیر کرنے جیسی ہیں۔ احمد سوز دکن کے نئے تخلیقی فضا خلق کرنے

والے شاعر ہیں۔ یہی ان کی غزل کا انفراد ہے۔

✍ پروفیسر صادق (10/اپریل 1943، اجین) تغیر پسند شاعر ہیں۔ صادق نے 1967 میں اجین سے اورنگ آباد کی طرف مراجعت کی تھی۔ ایم اے (اُردو) اور پی ایچ ڈی کی ڈگری اورنگ آباد سے حاصل کی۔ ان کے دو شعری مجموعے دستخط (1973) اور سلسلہ (1976) خاکِ دکن کی دین ہیں۔ وہ ناندیڑ کے پیپلس کالج سے ایک عرصہ تک وابستہ رہے۔ صادق کی غزل میں ہندی کی سبک لفظیات کا چابکدستی سے استعمال خوبی کے طور پر ظاہر ہوتا ہے۔ ہندی کے الفاظ ایسی مہارت سے برتتے ہیں کہ وہاں ان کے متبادل فارسی یا عربی کے الفاظ شرمسار سے دکھائی دینے لگتے ہیں۔ جانی مانی بحروں اور زمینوں میں نئے رنگ بھرنے کے سبب ان کے مضامین مانوسیت کے باوجود قاری کے ذہن کو ایک نئے جہان کی سیر کرواتے ہیں۔

✍ وحید واجد (11/فروری 1945ء رائچور) سجیلے غزل گو ہیں۔ ان کی غزل نگاری نئے اسلوب، نئی جہت اور نئی حسیت کی تابندہ مثال ہے۔ ہم عصر تخلیقی فضا وحید واجد کی غزل میں گہری ہے۔ کیوں کہ وہ شعری اسلوب کے تنوع کے ہنر آشنا ہیں۔ ان کا شعری سرمایہ تہہ داری اور فطری اظہار کا نمائندہ ہے۔

✍ ڈاکٹر قطب سرشار (15/مئی 1945ء محبوب نگر) خاموش طبع شاعر ہیں۔ ان کی غزل نگاری، غزل کش معاشرے میں اپنا انفراد رکھتی ہے۔ شاعر نے چشم دید ذاتی تجربات و مسائل کو معنی کی بلند آفرینی عطا کی ہے۔ ان کے ہاں تنہائی، اکیلے پن کا احساس، احتجاج کی صورت میں دکھائی دیتا ہے۔ عہدِ موجود کے ابتذال اور ادبار کی عکاسی شاعر نے پرسوز انداز میں کی ہے۔ قطب سرشار کی غزل گوئی میں ایک حرارت اور گرمی کے ہونے کا احساس شدید ہوتا ہے۔

✍ ڈاکٹر فہیم احمد صدیقی (5/فروری 1948ء ناندیڑ) سخنِ بے نظیر ہیں۔ ان کی غزل

گوئی حسنِ شعریت کا ندرتِ بیان ہے۔ تہہ در تہہ ان کی فنی اور فکری تخیل کی رنگینی نے انھیں غزل کا جدت طراز شاعر بنا دیا ہے۔ کیف انگیزی ان کی شاعری کا لب و لہجہ ہے۔ دلنواز ترنم فہیم صدیقی کا شعری مظہر ہے۔

✍ ڈاکٹر رؤف خیر (5/نومبر 1948، حیدرآباد) جدت پسند شاعر ہیں۔ اصناف شاعری میں انھوں نے نئے تجربے کیے جس سے اُن کی انفرادیت قائم ہوئی۔ زبان و بیان سے بے جا کھلواڑ سے بچتے ہوئے روزمرہ کی زبان میں دل میں اتر جانے والے شعر کہتے ہیں اور خوب کہتے ہیں۔ ان کی غزل لطیف قسم کی کاٹ سے عبارت ہے۔ طنز کے سبب قاری کو فوراً اپیل کرتی ہے۔ رؤف خیر کے یہاں غزل میں فطری اور سچا اظہار ہوتا ہے۔ یہی بات اُن کے تخلیقی جست کی کامیابی ہے۔

✍ سلیمان خمار (یکم مارچ 1949، بیجاپور) نے شاعری میں مشق و ممارست اُس وقت کی تھی جب ترقی پسند تحریک کی ترقی رک گئی تھی اور جدیدیت کی جدت پسندی عام ہونے لگی۔ انھوں نے عصری تقاضوں کے زیر اثر مختلف موضوعات کو اپنی شاعری کا حصہ بنایا مگر ان کے کلام میں ایک زیریں لہر رومانیت کی بھی ہے جس سے انکار ممکن نہیں۔ سلیمان خمار کی غزل آتی اور جاتی ہوئی سانسوں کا سنجوگ ہے۔ اپنے عہد کی کہانی ہے۔ ان کی غزلوں کا لہجہ عام سا محسوس ہوتا ہے مگر اس میں پھیلاؤ کی قوت ہے۔ ان کی غزل میں ایک بہاؤ ہے۔ یہ بہاؤ شاعر کے جذبات اور احساسات کا ہے۔ سلیمان خمار کا رنگِ سخن انفراد رکھتا ہے۔ انھوں نے غزل کو جیا ہے۔ وہ غزل مزاج شاعر ہیں۔ ان کی غزل میں جدید شاعری کی تابانی ہے۔ جو اذہان کو خیال انگیز کرتی ہے۔

✍ ڈاکٹر راہی فدائی (4/اکتوبر 1949، کڈپہ) مشکل پسند شاعر ہیں۔ مزاج کی تجربہ پسندی اور انفرادیت طلبی کے زیر اثر انھوں نے ہمیشہ سنگلاخ زمینوں میں اپنے فن کے جوہر دکھائے

ان کے لہجے کو انوکھا کہا جاسکتا ہے۔اجنبی نہیں، ہر نئی غزل بلکہ ہر نئے شعر، ہر نئے مصرع میں نئی اور کوئی ان کہی بات کو پیش کرنے کی کاوش انہیں ہجوم سے الگ کر دیتی ہے۔ایسے ایسے الفاظ استعمال کر جاتے ہیں جو کبھی اردو شاعری میں ان سے پہلے یا تو استعمال ہی نہیں ہوئے یا بہت شاذ استعمال ہوتے ہیں۔

✍ حامد اکمل (26؍دسمبر 1950، گلبرگہ) غزل کے باکمال شاعر ہیں، ان کی غزل ایک سوچتے ہوئے ذہن کی پیداوار ہے جو اپنے فن کے تقاضے پورا کرنے کے لیے گردوپیش کی دنیا پر گہری نظر رکھتے ہیں۔داخلی اور خارجی حقائق سے معاملہ کرتے ہوئے حامد اکمل اس بات کا ضرور خیال رکھتے ہیں کہ بات میں ابہام کے ساتھ ساتھ زود اثری بھی برقرار رہے۔روایت کا وسیع مطالعہ اور عصری رویوں سے واقفیت ان کو اپنے معاصرین میں نمایاں کرتی ہے۔

✍ رؤف صادق (5؍مئی 1953، بیڑ) مصور شاعر ہیں۔ان کی غزل میں عصری حسیت کا عنصر نمایاں ہوتا ہے۔اپنے گردوپیش کی روز بروز بدصورت ہوتی دنیا میں خوبصورتی کے امکانات ڈھونڈ نکالنا رؤف صادق کا بنیادی شعری رویہ ہے۔وہ اپنے اسلاف کے اخلاقی اقدار کا دفاع کرتے ہوئے اپنے عہد کی لڑکھڑاتی قدروں کی نشاندہی کرتے ہیں اور کبھی کبھار خود بھی حیرت زدہ رہ جاتے ہیں۔اپنے عہد سے وابستگی انھیں ایک ایسا ہمدرد انسان بنا دیتی ہے جو جدید انسان کی مریضانہ نفسیات پر صرف افسوس ہی نہیں کرنا چاہتا بلکہ اس کا مداوا بھی چاہتا ہے۔یہ ساری خوبیاں ان کے اشعار میں نئے نئے ذائقے بھر دیتی ہے جو کبھی نہایت تلخ ہوتے ہیں اور کبھی نہایت شیریں بھی۔

✍ نورالدین نور (12؍مئی 1954 گلبرگہ) نے اصناف شعر کے ہر صنف میں شاعرانہ اظہار کیا ہے۔وہ غزل کی رسومیات اور شعریات سے واقف ہیں اس لیے ان کی غزل میں عشق و محبت کے موضوعات کے ساتھ اخلاقی گراوٹ، سماجی بے انصافیوں، سیاسی بدعنوانیوں معاشرتی خرابیوں کا بیان شعری آہنگ کے ساتھ پیش ہوا ہے۔نورالدین نور کی شعری زبان میں سادگی، پرکاری سلاست اور روانی پائی جاتی ہے جس میں بلا کا تخلیقی وفود آموجود ہوتا ہے۔ان کی غزل روایت اور جدیدیت سے ہم آمیز ہے جس میں وہ کامیاب ہیں۔

✍ ساجد حمید (20؍مئی 1954، شموگہ) تنوع پسند شاعر ہیں۔ان کا صاف وشفاف شعری رویہ ان کی غزلوں میں انسانی جذبات اور احساسات کی کامیاب عکاسی کرتا ہے۔سادہ لفظیات، رواں لہجہ اور اسلوب کی تازہ کاری قاری کو متاثر کیے بنا نہیں رہتی۔فارسی وعربی کی ثقیل تراکیب سے شعوری اجتناب اور کہیں کہیں ہندی کے عام فہم الفاظ کا استعمال ساجد حمید کی غزل کو خوش آہنگ بنا دیتا ہے۔ساجد حمید کی غزل اردو قاری کو نئی فرہنگ سے متعارف بھی کراتی ہے۔جس سے شاعر کے خلاقانہ عمل کا پتا چلتا ہے۔یہی خوبی ساجد حمید کی غزل کی انفرادی شان ہے۔

✍ ڈاکٹر حشمت فاتحہ خوانی (یکم جنوری 1957، گلبرگہ) کی غزل کلاسیکی اسلوب اور جدید رجحان کی طرف ایک جست کا حکم رکھتی ہے۔وہ غزل میں، نئی جمالیات، نئے احساس، نئے انداز اور نئی فکر کے امین ہیں۔ان کی غزل میں عصری مسائل موجود ہیں۔حشمت فاتحہ خوانی کی غزل اُن کے پرواز فکر کا پتا دیتی ہے۔انھوں نے جتنی بھی غزلیں کہیں ہیں ان میں تازگی ہے وہ اپنے احساسات واقعات اور سانحات خوبصورت پیرائے میں بیان کرتے ہیں۔

✍ ڈاکٹر سلیم محی الدین (23/مئی 1963، پربھنی) دل نواز شاعر ہیں۔ان کے شعری محرکات روزہ مرہ کی ناہمواریوں، بیان کی آڑی ترچھی لکیروں سے کلاسیکی ورثے کی گواہی دیتے ہیں۔سلیم محی الدین کی شعری فضا میں بلا کی ندرت پائی جاتی ہے۔تازہ کاری کا احساس گہرا ہوتا ہے۔سلیم محی الدین،قمر اقبال کے تلمیذ رشید رہے،لیکن استاد کا رنگ غزل ان کی غزل پر محسوس نہیں ہوتا ہے۔انھوں نے اپنی ایک الگ راہ بنائی۔ان کی غزل بدلتا ہوا معاشرہ بدلتی ہوئی تہذیب اور بدلتی ہوئی اقدار کا نوحہ ہی نہیں ہے بلکہ اس میں گہرا سماجی شعور ہے جو صرف سلیم محی الدین کی غزل کا خاصا ہے۔

✍ ڈاکٹر مقبول احمد مقبول (یکم جنوری 1965، چنگوپہ، بیدر) غزل کے مقبول و معروف شاعر ہیں۔وہ آئینہ ماضی کی شعریات سے استفادہ کرتے ہوئے نئے حالات اور ماحول، نئی فکر، نئے سانچے اور نئے رموز و علائم ایجاد کرتے ہوئے عہد موجود کے آئینے سے اپنی غزل کو مزین کرتے ہیں۔مقبول احمد مقبول کی غزل شاعر کے حساس اور بیدار مغز ہونے کی دلیل ہے۔ ان کے خیال اور زبان و بیان میں پیچیدگی نہیں ہے بلکہ وہ روزمرہ کی زبان میں اپنے جذبات و احساسات اور فکر خیال کو شاعرانہ روپ عطا کرتے ہیں۔مقبول احمد مقبول کا مطالعہ، مشاہدہ خارجی اور داخلی سطحوں پر گہرا ہے جس سے اُن کی غزل میں عصری شعور، دلکشی اور دل پذیری قائم و دائم ہے۔

✍ ڈاکٹر سید اقبال خسرو قادری (2/مئی 1965، کڈپہ) اُردو شعر گوئی کا درخشاں اسم ہیں۔شعبہ غزل خسرو قادری کے لیے حرز جاں ہے انھوں نے غزل نگاری میں اپنے اسلاف سے انحراف کرتے ہوئے اپنا جداگانہ ڈکشن قائم کیا ہے۔اپنے آپ سے مخاطب کرنے کا انداز یا خود کلامی کا انداز ان کے اشعار کی خوبی ہے۔خسرو قادری کے کلام میں تصوف مزاج اشعار علم تصوف کے اصطلاحی نظام کے ساتھ آنکھوں کو خیرہ کرتے ہیں۔ان اشعار میں حق شناسی اور بیدار مغزی

روحانیت کی سطح پر محسوس کی جاسکتی ہے۔تصوف کے اسرار و رموز کو وہی جانتے ہیں جن کے دلوں میں اخلاص تقوی اور تزکیہ ہو۔خسرو قادری کے عارفانہ کلام میں نفس کی پاکیزگی، اخلاق میں عمدگی اور تعمیر باطن کا واضح بیان ملتا ہے۔خسرو قادری شعر کے لفظی و معنوی ابعاد پیدا کرنے کا ہنر خوب آتا ہے۔غزل میں انھوں نے دقیق اور ادق لفظوں کے سہارے سے اپنی شعری کائنات کو سجایا ہے۔اسالیب، ندرت خیال اور لفظی در و بست میں شاعر نے کمال دکھایا ہے۔نئی نئی زمینوں کی سیاحت کی ہے۔خسرو قادری نے اپنی فکری فطانت سے اثبات پسندی سے کام لیتے ہوئے کلام میں نئے جہان دریافت کیے ہیں۔ان کا شعری رویہ اپنی زمین سے پھوٹنے والا وہ شجر ہے جس کے پھل ثمر آور ہیں۔وہ ایسے ناظر ہیں جو اپنے اشعار میں جوانب پر نگاہ رکھتے ہوئے اُس کے مہناج قائم کرتے ہیں اور اُن کا کلام اور نگ کی شکل اختراع کر لیتا ہے۔خسرو قادری کی غزل میں جمالیاتی حسن، مسرت اور بہجت کا احساس توانا ہے۔جس کے سبب وہ دکن کے مختلف شاعر ہیں۔

✍ سردار سلیم (20/ستمبر 1973، حیدر آباد) اردو غزل کے قربت گو شاعر ہیں۔ شاعری ان کا اوڑھنا بچھونا ہے۔شاعری اور عصری تعلیم میں سردار سلیم کا باضابطہ کوئی استاد نہیں رہا۔ مطالعہ مشاہدہ اور سیاحت ان کے استاد ہیں۔ان کی غزل روایتوں سے انحراف اور انکار کرتی ہے۔ انھوں نے غزل میں نئے تجربے، نئی زمینیں، نئے تراکیب کا استعمال کیا ہے۔ان کی غزل میں جدت، نیا حسن، اور نئے تخیلات پائے جاتے ہیں۔سردار سلیم کی غزل اپنے ہونے کی گواہی دیتی ہے۔جس میں طنز، اخلاقیات، تخلیقی بصیرت، مضمر ہے۔خیالات کی ندرت، نظر کی گہرائی و بلندی بدرجہ اتم سردار سلیم کی غزل میں پائی جاتی ہے۔سردار سلیم کی غزل نے میلوں کا فاصلہ کم مدت میں طے کر لیا ہے۔دکن سے اُن کی توانا آواز نے اُردو غزل کو متوجہ اور راغب کیا ہے۔سردار سلیم کے دلنواز شاعری نے جدت طرازی کے نئے ابعاد قائم کیے ہیں۔ان کی غزل پختہ پن، تہہ داری اور آفاقی دردمندی کی روشن علامت ہے۔یاد رہے کہ سردار سلیم کی شاعری کا انتخاب مرکزی ساہتیہ

اکادمی نے 2003 میں ’’دھیان کی رحل‘‘ شائع کر کے دکن کے اس شاعر خوش بیان کی عزت افزائی کی تھی۔

✍ واجد اختر صدیقی (10/اکتوبر 1974ء الند، ضلع گلبرگہ) جدید ترین نسل کے خوش فکر شاعر ہیں۔ ان کی غزل نگاری کا انسلاک اپنی خاک سے ہے۔ ان کی غزلیں تازگی بلند آہنگی اور نغمگی سے عبارت ہیں۔ واجد اختر صدیقی کی شاعری میں حسنِ شعریت کا ایک خاص اہتمام ملتا ہے۔ وہ ان کی غزلوں میں نئے پن کا موجب ہے۔ ان کے غزلیہ شاعری راست مخاطبہ قائم کرتی ہے۔ یہ شعری مخاطبہ جدت طرازی کا ایک امکانی حوالہ ہے۔

✍ مجتبٰی نجم (17/اپریل 1977ء، گیورائی بیڑ) شعبہ شاعری کا نیا استعارہ نیا نام ہے۔ ادب کا ذوق اپنے والد محترم ڈاکٹر اسماعیل شوق مرحوم سے لیا۔ مجتبٰی کے والد گرامی سچے اور عمدہ شاعر کے علاوہ فنِ خطاطی میں ماہر نوری نستعلیق تھے۔ مجتبٰی نجم کے ایوانِ غزل میں تخیل کی رنگینی، جمالیاتی تحیر اور لہجے کا حسن ہے۔ مجتبٰی اگرچہ اُردو غزل میں نو آمدہ ہیں مگر ان کی غزل میں جیتی جاگتی دھڑکنیں، تخلیقی حرارت کا پتا دیتی ہیں۔ بے حد تازہ شگفتہ مزاج، ان کی غزل مٹی سے جڑی ہے۔ ان کی غزل دراصل کتاب دل کا افسانہ ہے۔ دولت بیدار نے ان کے کلام کو امکانی سمتوں کا حوالہ بنا دیا ہے۔

بالائی سطور میں راقم التحریر نے کتاب میں شامل شعرائے عظام کا مختصر تذکرہ کیا ہے۔
زیر نظر کتاب کے شعرا کی غزلوں کے مطالعے سے یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ یہ شعرا شعری روایت ،شعری اسالیب اور شعری ادراک کے حامل ہیں۔ ان کی غزل سرائی میں سچی گرمی ہے۔ جو دکن کی غزل کا مقبول ہونے کا سبب ہے۔ ان شعرا نے شعر و نغمہ میں احساس جمال پیدا کیا ہے گھن گرج سے کام نہیں لیا ہے۔ بلکہ مہارت وصناعی کا مظاہرہ کیا جس سے ان کے کلام میں ادراک کی آمیزش پیدا ہوتی ہے۔ زیر نظر انتخاب سے دکن کی غزل کا شعری محاورہ رچاؤ، نغمگی، کیف انگیزی، وجد

آفرینی اور محویت محسوس کی جاسکتی ہے۔ انتخاب کے کئی شعرا کے ہاں مضمون آفرینی بھی ہے۔ جس کو پڑھنے کے بعد غزل کا رنگ دوبالا اور دوچند ہو جاتا ہے۔ بہرصورت کتاب میں شامل شعرا کا کلام جہانِ غزل میں اپنی پہچان اور شناخت رکھتا ہے کیوں کہ یہ غزلیں اردو غزل کے گھنے اور گہرے سایے ہیں۔

برادرِ خرد انجینئر خرم عماد سہروردی ایم ٹیک نے راقم التحریر سے چنئی تمل ناڈو کی ہوٹل مرحبا میں دورانِ گفتگو کہا کہ دکن کے منتخب شعرا کی غزلوں کا انتخاب وقت کی اہم ضرورت ہے۔ یہ کتاب دراصل برادرِ عزیز خرم عماد کی خواہش کی تکمیل ہے جو وقت کو یاد رہے گی۔

کتاب ’’کلام تجھ لب کا‘‘ کی تحقیق، ترتیب اور تسوید کے سلسلے میں راقم التحریر پروفیسر حمید سہروردی، پروفیسر شاہ حسین نہری، ڈاکٹر وہاب عندلیب، جناب رؤف صادق، جناب حامد اکمل، ڈاکٹر سید اقبال خسرو قادری، پروفیسر عبدالرب استاد، ڈاکٹر انیس صدیقی اور جناب واجد اختر صدیقی کے مشوروں اور آرا کے لیے ممنون ہے۔ یہ بات خاطر نشان رہے کہ کتاب میں شامل شعرا کی فہرست صرف اور صرف راقم التحریر کی مرتب کردہ ہے۔ اس میں کسی سے مشورہ نہیں لیا گیا ہے۔ کتاب میں شامل مرحوم شعرا کے لواحقین سے اجازت لی گئی۔ راقم التحریر مرحومین کے افرادِ خاندان کا بھی شکریہ ادا کرتا ہے۔

اپنے ہم مکتب، ہم خیال اور ہم راز ساتھی ڈاکٹر محمد سہیل احمد نے کتاب میں شامل غزلوں کے بحور، اوزان اور علم عروض کے معاملات کو دیکھا۔ میں ان کے احسان سے گراں بار ہوں۔ میرے عزیز دوست برادرِ محترم محمد عارف اقبال اور محترم باسط فگار کی صلاحیتیں کتاب کی تکنیکی ترتیب میں کارفرما ہیں، میں اُن کا بے حد ممنون ہوں۔

باذوق قارئین ،کلام تجھ لب کا، کی غزلیں اب آپ کے حوالے!!!

●●

احسنؔ یوسف زئی

ہوا کے رخ پہ بہنا ہے مناسب
تو پھر میرا پتہ کیوں پوچھتے ہو

غزلیں

احسنؔ یوسف زئی

(۱)

لہر سے لہر کا ناتا کیا ہے
مجھ پہ الزام پھر آتا کیا ہے

بولتی آنکھوں میں بلّور کی روح
سنگِ آواز اُٹھاتا کیا ہے

روز وشب بیچ دیے ہیں میں نے
اس بلندی سے گراتا کیا ہے

لاکھوں برسوں کے سفر سے حاصل
دیکھنا کیا ہے دکھاتا کیا ہے

تیر اندھے ہیں شکاری اندھا
کھیل ہے کھیل میں جاتا کیا ہے

(2)

میں کہاں ہوں؟ (عجیب پاگل ہو)
کون ہوں؟ (بے حضور بادل ہو)
سب سے رشتہ ہے بے لوث میرا
(صرف اپنے ہی سر کا آنچل ہو)
وقت کی آنکھ میں اُجالا ہوں
(ہوش میں آؤ تم تو کاجل ہو)
موجۂ وقت میں ، (زمانے میں؟)
میں گہر ہوں! (کہ چیختا پل ہو)
جسم زنجیر ، (اور تم قیدی)
روح کا گھر ہوں (صرف مقتل ہو)

(3)

کیا کیا آس ہماری تھی
(آخر بھول تمھاری تھی)
پتہ شاخ سے ٹوٹا تھا
(اُس نے عمر گزاری تھی)
کیسے رات کٹے گی آج؟
(رات تو کل بھی بھاری تھی)
دنیا تاج ہے کانٹوں کا
(پہلے کب پھلواری تھی)
دوست بنایا غیروں کو
(وہ بھی دنیا داری تھی)

(4)

گھر گھر آپس میں دشمنی بھی ہے
بس کھچا کھچ بھری ہوئی بھی ہے
ایک لمحے کے واسطے ہی سہی
کالے بادل میں روشنی بھی ہے
نیند کو لوگ موت کہتے ہیں
خواب کا نام زندگی بھی ہے
راستہ کاٹنا ہنر تیرا
ورنہ آواز ٹوٹتی بھی ہے
خوبیوں سے ہے پاک میری ذات
میرے عیبوں میں شاعری بھی ہے

(5)

سبھوں کا غم سبھی جانیں
بس اتنا بھی کبھی جانیں
ہوا کے تند جھونکے کیا
کمالِ نازکی جانیں
جو دیکھیں رات میں سورج
زمانے کو وہی جانیں
گلی روشن اندھیرے گھر
دِوانے کو ولی جانیں
بس اتنا اُن سے کہیے گا
کہ مجھ کو آدمی جانیں

راہیؔ قریشی

بس اک شکستِ تمنا کا سلسلہ سمجھو
حیات کچھ بھی نہیں تلخ تجربوں کے سوا

غزلیں

راہیؔ قریشی

(۱)

چمکا دے ایک رنگِ تمنا یہیں کہیں
گم ہو نہ جائے قرب کا لمحہ یہیں کہیں

رہنے دے تھوڑی دیر رفاقت کی روشنی
ممکن ہے ساتھ چھوڑ دے دنیا یہیں کہیں

مہکے ہے ایک یاد کی خوشبو سے غمکدہ
گونجے ہے اک نغمہ سا لہجہ یہیں کہیں

غم خوار بن کے کر دے عطا ایک زخم نو
ہمدرد بن کے دے کوئی دھوکا یہیں کہیں

راہیؔ یہ کون ہے کہ ہر اک انجمن سے دور
سائے کو ڈھونڈتا ہے اکیلا یہیں کہیں

(2)

گراں خواب بستی کو بیدار کر دے
اندھیرے پس پشت ِ دیوار کر دے
برستی رہے پیاس دھرتی پہ کب تک
سلگتی فضاؤں کو سر شار کر دے
اُگا دے مرے صحن میں خار، لیکن
زمیں دشت و صحرا کی گلزار کر دے
سفینہ ہم آغوش طوفاں ہے اب تک
ڈبو دے اسے ، یا اسے پار کر دے
نہ دے مجھ کو منزل کا کوئی فریب
مری راہ کچھ اور دشوار کر دے

(3)

اگر یہ غم ساز گار نکلے
اسی سے شاید قرار نکلے
مسرتوں میں نہاں تھے آنسو
محل گرے تو مزار نکلے
چمن سے نکلے تو دامنوں میں
نہ گل ہی نکلے ،نہ خار نکلے
جو دست و دامن ہوئے کشادہ
تو شاخِ گل سے شرار نکلے
رفیق ہے صرف عکس ، راہیؔ
ہم اپنے ہی غمگسار نکلے

(4)

وہ خفا ہے نہ مہر باں سا ہے
اک تعلق مگر نہاں سا ہے
فاصلوں میں بدل نہ جائے کہیں
اُس سے جو ربط ،جسم و جاں سا ہے
کیا مراسم کی آرزو رکھتیں
حرفِ اخلاص ہی گراں سا ہے
یہ رفاقت بھی ہے بہت ، کہ ابھی
عکسِ آئینہ ہم زباں سا ہے
آنگنوں سے کہیں نہ اُٹھا ہو
رہگذاروں میں جو دھواں سا ہے

(5)

دشت و صحرا کو بسانا تھا، سفر کرنا تھا
اپنے خوابوں کا حسیں شہر کھنڈر کرنا تھا
زندگی کتنے سلیقے سے گذاری ہم نے
زخم روتے تھے ،مگر ہنس کے بسر کرنا تھا
خاک کو خون دیا ، اک نئی تاریخ لکھی
ہاتھ خالی تھے مگر معرکہ سر کرنا تھا
اُس دریچے سے کیا کرتی تھیں آنکھیں باتیں
اُس دریچے پہ بہر حال نظر کرنا تھا
اک نہ اک زخم سے رکھا کوئی رشتہ باقی
یو ں مداوائے غمِ دیدۂ تر کرنا تھا

محمد یوسفؔ عثمانی

کتابِ عمر کے اوراق کتنے سادہ ہیں
کبھی تو دیکھ کہ اس کا بھی کچھ حساب لگے

غزلیں

محمد یوسفؔ عثمانی

(۱)

جب سے خانۂ دل پر بدظنی کے تالے ہیں
جس طرف نظر جائے دشمنی کے جالے ہیں

تلخ و تند ماضی کے کیوں ورق الٹتے ہو
وقت کی کتابوں میں اور بھی حوالے ہیں

خوف اب نہیں مجھ کو راہ سے بھٹکنے کا
اس جہاں کے سب منظر میرے دیکھے بھالے ہیں

ایک حرم کے گرنے پر یوں نہ ہو پراگندہ
قریۂ محبت میں اور بھی شوالے ہیں

اس نگر میں بس یوسفؔ دو ہی چیزیں ارزاں ہیں
آبلے ہیں پاؤں کے یا نظر کے چھالے ہیں

(2)

دل کے نزدیک جو اعانت ہے
عقل کے واسطے اہانت ہے
جتنی خوشیاں کہو عطا کردیں
غم کسی کی مگر امانت ہے
موت سے دور بھاگنے والو
زندگی کی یہی ضمانت ہے
پھول کھلتے نہیں ہواؤں سے
یہ صبا کی فقط ذہانت ہے
نغمۂ عیش میں وہ بات کہاں
غم کے لہجے میں جو متانت ہے

(3)

تلخ ماضی کے کچوکوں سے جو گھبرایا ہوں میں
ڈھاکے قصرِ مصلحت باہر نکل آیا ہوں میں
کچھ نئی شکلیں اُبھر کر سامنے آنے لگیں
جب بھی ذہنی الجھنوں سے جاکے ٹکرایا ہوں میں
اب خلوص و مہر کے اوراق سارے پھٹ گئے
تجربوں کی سب کتابیں چھان کر آیا ہوں میں
کیا ضروری ہے کہ سب ہی وہ لڑائی لڑسکیں
جس محاذِ زندگی سے لوٹ کر آیا ہوں میں
پتھروں کے اس نگر میں شیشۂ الفت کے ساتھ
آکے یوسفؔ کیا بتاؤں کتنا پچھتایا ہوں میں

(4)

چوٹ کھاتا ہے مسکراتا ہے
دل کو جینے کا ڈھنگ آتا ہے
کٹ کے دنیا سے جو ٹھہر جائے
وہی لمحہ تو سب کو بھاتا ہے
یاس ہر رات کو سلاتی ہے
شوق ہر صبح کو جگاتا ہے
دل کے ہاتھوں ہیں ہم ستائے ہوئے
آسماں تو کسے ستاتا ہے
خود فریبی کا کھیل ہے یوسفؔ
داستاں جو نئی سناتا ہے

(5)

تارا فلک سے ٹوٹ کے گرتا ہی دیکھ لیں
غمگیں حسیں نظر کا اشارا ہی دیکھ لیں
پل بھر کی ایک لذتِ بے نام ہی سہی
خوابوں میں روشنی کا جزیرا ہی دیکھ لیں
کھوئے ہیں کیسے قافلے اپنی ہی گرد میں
پیچھے ٹھہر کے آج تماشا ہی دیکھ لیں
در پردہ قرب کرتا ہے مجروح کس طرح
ساحل پہ جاکے کٹتا کنارا ہی دیکھ لیں
کب تک گنیں گے بیٹھ کے موجوں کے زیر و بم
اک بار کیوں نہ ڈوب کے دریا ہی دیکھ لیں

صابرؔ فخرالدین

بن گیا ہے نشانِ منزلِ شوق
وہ جو پتھر کہ سدِ راہ بھی ہے

غزلیں

صابرؔ فخرالدین

(۱)

جو راہِ دشت و در پہچانتے ہیں
وہی تو اپنا گھر پہچانتے ہیں

نظر رکھتے ہیں اپنے آپ پر جو
وہ اوروں کی نظر پہچانتے ہیں

ہیں ان کے دست و بازو سر بریدہ
جو موسم کی ڈگر پہچانتے ہیں

مجھے لگتا ہے اب دشمن بھی میرے
مرے اندر کا ڈر پہچانتے ہیں

ہم ایسے قافلے والے ہیں صابرؔ
جو اپنی رہ گزر پہچانتے ہیں

(2)

راستہ جب کبھی وہ کھوتا تھا
منزلوں سے قریب ہوتا تھا
جسم و جاں کی جراحتوں کو بھی
اپنی سانسوں میں وہ پروتا تھا
خواب بن کر وہ میری آنکھوں میں
یاد کی سوئیاں چبھوتا تھا
جانے کیوں اُتھلے پانیوں میں وہ
کشتیاں شوق کی ڈبوتا تھا
خشک آنکھیں تھیں اس کی پر صاؔبر
دامنِ دل مرا بھگوتا تھا

(3)

فلک کا استعارہ اور کچھ تھا
مگر دھرتی کا تارا اور کچھ تھا
سنبھالا میں نے اپنے آپ کو بھی
ارادہ تو تمھارا اور کچھ تھا
جو باہر تھے نظارے اور ہی تھے
مگر اندر نظارہ اور کچھ تھا
مجھے تصویر ان کی دیکھنی تھی
وہ منظر وہ نظارہ اور کچھ تھا
چھپائی جا رہی تھی جب حقیقت
تو ہم پر آشکارا اور کچھ تھا

(4)

کیا بتائیں جناب کیا ہوگا
وقت کا احتساب کیا ہوگا
زندگی کے عذاب سے بڑھ کر
زندگی کا عذاب کیا ہوگا
ہاتھ میں ان کے آئنہ دے دو
اس سے اچھا جواب کیا ہوگا
وہ تو خود ہی جواب ہے اپنا
اس کا کوئی جواب کیا ہوگا
وقت ہی یہ بتائے گا صاؔبر
وقت کا انتخاب کیا ہوگا

(5)

لہو لہو جو سمندر دکھائی دیتا ہے
وہ میری آنکھ کے اندر دکھائی دیتا ہے
یہ میرے اپنے ہی اعمال کا نتیجہ ہے
جو میرے سامنے اکثر دکھائی دیتا ہے
ہر ایک آدمی اب اپنے سر پہ اوڑھے ہوئے
مجھے تو خوف کی چادر دکھائی دیتا ہے
میں اس کو اپنے لیے آئنہ بناؤں گا
جو میری راہ کا پتھر دکھائی دیتا ہے
وہ جس کے ہاتھ ہیں خوں سے رنگے ہوئے صاؔبر
وہی تو خواب میں اکثر دکھائی دیتا ہے

قمر اقبال

ستارے ٹوٹ کے مٹی میں منہ چھپاتے ہیں
ابھی زمین سے رشتہ ہے آسمانوں کا

غزلیں

قمر اقبال

(۱)

سب پگھل جائے تماشا وہ اِدھر کب ہوگا
موم کے شہر سے سورج کا گزر کب ہوگا

خواب کاغذ کے سفینے ہیں بچائیں کیسے
ختم اس آگ کے دریا کا سفر کب ہوگا

جس کا نقشہ ہے مرے ذہن میں اک مدت سے
گھر وہ تعمیر سے پہلے ہی کھنڈر کب ہوگا

میرے کھوئے ہوئے محور پہ جو پہنچائے مجھے
اب لہو میں مرے پیدا وہ بھنور کب ہوگا

سبز رکھا ہے جسے میں نے لہو دے کے قمر
مہرباں دھوپ میں آخر وہ شجر کب ہوگا

(2)

جینا ہے سب کے ساتھ کہ انسان میں بھی ہوں
چہرے بدل بدل کے پریشان میں بھی ہوں
جھونکا ہوا کا چپکے سے کانوں میں کہہ گیا
اک کانپتے دیے کا نگہبان میں بھی ہوں
انکار اب تجھے بھی ہے میری شناخت سے
لیکن نہ بھول یہ تری پہچان میں بھی ہوں
آنکھوں میں منظروں کو جب آباد کر لیا
دل نے کیا یہ طنز کہ ویران میں بھی ہوں
اپنے سوا کسی سے نہیں دشمنی قمر
ہر لمحہ خود سے دست و گریبان میں بھی ہوں

(3)

خود کی خاطر نہ زمانے کے لیے زندہ ہوں
قرض مٹی کا چکانے کے لیے زندہ ہوں
کس کو فرصت جو مری بات سنے زخم گنے
خاک ہوں خاک اڑانے کے لیے زندہ ہوں
لوگ جینے کے غرض مند بہت ہیں لیکن
میں مسیحا کو بچانے کے لیے زندہ ہوں
روح آوارہ نہ بھٹکے یہ کسی کی خاطر
سارے رشتوں کو بھلانے کے لیے زندہ ہوں
خواب ٹوٹے ہوئے روٹھے ہوئے لمحے وہ قمر
بوجھ کتنے ہی اٹھانے کے لیے زندہ ہوں

(4)

جو پڑ گئی تھی گرہ دل میں کھولتے ہم بھی
وہ بات کرتا تو کچھ اُس سے بولتے ہم بھی
ہوا کو کس نے چھوا ہے جو تجھ کو چھو پاتے
خلا میں پھرتے ہیں رستہ ٹٹولتے ہم بھی
کہاں پہ ٹھہریں کہ مانندِ برگِ آوارہ
ہوا کے دوش پہ پھرتے ہیں ڈولتے ہم بھی
اندھیرا شہر کی گلیوں کا گھر میں در آتا
ذرا جو رات کو دروازہ کھولتے ہم بھی
قمر یہ لطف نہ جینے کا پھر ہمیں آتا
لہو میں زہر اگر خود نہ گھولتے ہم بھی

(5)

ہر خوشی مقبروں پہ لکھ دی ہے
اور اداسی گھروں پہ لکھ دی ہے
ایک آیت سی دستِ قدرت نے
تتلیوں کے پروں پہ لکھ دی ہے
جالیوں کو تراش کر کس نے
ہر دعا پتھروں پہ لکھ دی ہے
لوگ یوں سر چھپائے پھرتے ہیں
جیسے قیمت سروں پہ لکھ دی ہے
ہر ورق پر ہیں کتنے رنگ قمر
ہر غزل منظروں پہ لکھ دی ہے

جاویدؔ ناصر

رات آ جائے تو پھر تجھ کو پکاروں یارب
میری آواز اُجالے میں بکھر جاتی ہے

غزلیں

جاویدؔ ناصر

(۱)

آہٹ بھی اگر کی تو تہہ ذات نہیں کی
لفظوں نے کئی دن سے کوئی بات نہیں کی

اظہار نہ آنکھیں نہ تحکّم نہ قرینہ
لہجے نے بھی عرصے سے ملاقات نہیں کی

اصرار تھا ماتھے پہ نہ آنکھوں میں نمی تھی
تم نے تو رعایت بھی مرے ساتھ نہیں کی

ترتیب دیا اس کے لیے شورِ انا کو
ہم نے بھی کئی دن سے بہت رات نہیں کی

دو چار ہواؤں کے قدم دھوپ کے چھینٹے
جاویدؔ نے شعروں میں نئی بات نہیں کی

(2)

بہت اداس تھا اُس دن مگر ہوا کیا تھا
ہر ایک بات بھلی تھی تو پھر برا کیا تھا
ہر ایک لفظ پہ لازم نہیں کہ غور کروں
ذرا سی بات تھی ویسے بھی سوچنا کیا تھا
مجھے تو یاد نہیں ہے وہاں کی سب باتیں
کسی کسی پہ نظر کی تھی دیکھنا کیا تھا
گلی بھی ایک تھی اپنے مکاں بھی تھے نزدیک
اسی خیال سے آیا تھا پوچھنا کیا تھا
میں جس کی زد میں رہا آخری تسلی تک
خدائے برتر و اعلیٰ وہ سلسلہ کیا تھا

(3)

چلا جو گھر سے تو رشتے دعا میں ڈوب گئے
لہو ہے تیز پرندے ہوا میں ڈوب گئے
ابھی زمین تو سیلاب ہی کی زد میں ہے
فرشتے خود کی ہی حمد وثنا میں ڈوب گئے
نوید فتح سنی تھی دلوں کی مجلس میں
سماعتوں کے سمندر صدا میں ڈوب گئے
بشارتوں کی کہانی کہاں پہ پہنچی ہے
کہ لوگ اپنی ہی آوازِ پا میں ڈوب گئے
جنھیں عزیز تھے مضمون آنے والوں کے
وہ سارے لفظ تو طرزِ ادا میں ڈوب گئے

(4)

زمیں پہ رہ کے ستارہ سا ہو گیا تھا میں
مجھے خبر ہے، تمھارا سا ہو گیا تھا میں
بلائے جاں تھی، مگر کتنا پھوٹ کر روئی
ندی کے بیچ کنارہ سا ہو گیا تھا میں
کسی نے میری متانت کا جب سبب پوچھا
بس ایک پل میں بچارہ سا ہو گیا تھا میں
میں نیک نام، نہ رسوا مگر سرِ محفل
یہ اور بات، گوارا سا ہو گیا تھا میں
بہت خلاف تھی آنکھیں، بہت اُداس تھا دن
خود اپنے گھر میں نظارہ سا ہو گیا تھا میں

(5)

بری خبر ہے، اِسے مشتہر نہیں کرتے
کسی کے عیب کو یوں بے ہنر نہیں کرتے
مرے بزرگ ہیں طولِ کلام کے شیدا
کہانیوں کو کبھی مختصر نہیں کرتے
مجھے بھی شوق ہے دنیا کو فتح کرنے کا
مگر پہاڑ کو عجلت میں سر نہیں کرتے
نہ جانے کون سا موسم ہو پھول پتوں کا
اسی لیے تو یہ پودے سفر نہیں کرتے
میں آج اپنے ہی اخلاق سے پریشان ہوں
تکلفات مجھے معتبر نہیں کرتے

مظہرؔ محی الدین

مجھے یہ شرط بھی منظور ہے تری خاطر
شریکِ بزم رہوں اور نظر نہ آؤں میں

غزلیں

مظہر محی الدین

(۱)

اب مرے شہرِ تمنا کو میں جاؤں کیسے
اُس کو ڈھونڈوں اُسے دیکھوں اُسے پاؤں کیسے

دستکیں دیتی ہیں مسموم ہوائیں ہر دم
اپنی تنہائی کو آنگن میں بلاؤں کیسے

ایک دیوار اُصولوں کی ہے حائل پھر بھی
ایک رشتہ ہے محبت کا بھلاؤں کیسے

ان زمیں بوس مکانوں پہ جو گزری ، گزری
آگ جو دل میں ابھی تک ہے بجھاؤں کیسے

خون معصوم اُجالوں کا جو ٹپکا شب بھر
ضبطِ تحریر میں مظہرؔ اُسے لاؤں کیسے

(2)

ہر طرف خوں چکاں فضا ہے ابھی
کربلا اور کربلا ہے ابھی
صبح ہو گی تو آگے سوچیں گے
درد صحرا میں رتجگا ہے ابھی
اُس سے بچھڑے ہوئے زمانہ ہوا
بھول جانے کا مرحلہ ہے ابھی
خود سے باہر ہے کیا وہ کیا جانے
سامنے اُس کے آئنہ ہے ابھی
فن سے بیعت کیے زمانہ ہوا
ایسا لگتا ہے فاصلہ ہے ابھی

(3)

یہ شعر گوئی عقدہ کشائی نہیں تو کیا
بے چہرگی کی چہرہ نمائی نہیں تو کیا
یوں رنگِ رائگاں کے تعاقب میں رات دن
مصروفِ کار، خود سے جدائی نہیں تو کیا
لفظوں کو جوڑ لینا کمالِ ہنر نہیں
رنگ ِ غزل لہو سے حنائی نہیں تو کیا
دنیا تو خیر دنیا ہے اب اس سے کیا غرض
تجھ تک مرے ہنر کی رسائی نہیں تو کیا
یہ رتجگا ، یہ خونِ جگر، یہ سخن وری
مظہرؔ یہ عمر بھر کی کمائی نہیں تو کیا

(4)

آدمی لاپتا نہیں ہے کیا
وقت کی یہ صدا نہیں کیا
دستکیں دے رہا ہے اک اک پل
تو قرینِ قضا نہیں ہے کیا
نعمتوں کا حساب دینا ہے
ہر بشر جانتا نہیں ہے کیا
خود کو آزاد جاننے والے
کوئی نگراں ترا نہیں ہے کیا
زندگی کس نے دی ہے کیوں دی ہے
آنکھ سے ماورا نہیں ہے کیا

(5)

راستہ گم شدہ نہیں ہے کیا
دل پہ پردہ پڑا نہیں ہے کیا
خوش مزاجی کٹھن سہی لیکن
اس میں خود کا بھلا نہیں ہے کیا
کیا کہا! کون زور آور ہے
وقت فرما روا نہیں ہے کیا
کب سے آواز دے رہا ہے کوئی
دل کا دروازہ وا نہیں ہے کیا
تو نے جو بیج دل میں بویا تھا
پیڑ ویسا اُگا نہیں ہے کیا

محسن جلگانوی

یہ قسط قسط کا جینا مجھے قبول نہیں
بس ایک سانس میں اے زندگی گذار مجھے

غزلیں

محسن جلگانوی

(۱)

رات جاگی تو تری یادوں کا دفتر بھی کُھلا
ایک دروازہ مری روح کے اندر بھی کُھلا

ہر تعلق کے لیے بند رکھا ہے جس کو
ہم نے رکھا ہے ترے واسطے وہ در بھی کُھلا

دور تک سحر زدہ سایوں کی پنہائی سے
ایک دیوار جو ٹکرائی تو منظر بھی کُھلا

اب تو کردار کے چہروں پر مکھوٹے بھی نہیں
محتسب بھی ہے کھلا اور ستم گر بھی کُھلا

ڈھنگ سے سنگِ ملامت کو نشانے پہ لگا
لے ترے واسطے اب چھوڑ دیا سر بھی کُھلا

(2)

سخن کے باب میں سب استعارے اپنے ہیں
علامتیں بھی ہیں اپنی اشارے اپنے ہیں
ندی تو سبز پری ہے نہ ہاتھ آئے گی
نواحِ آب کے سارے خسارے اپنے ہیں
تمھارے پانی کی سرحد یہیں سمٹتی ہے
زمیں یہاں سے ہماری کنارے اپنے ہیں
تو جھوٹے رشتوں کی تہہ داریاں تمام ہوئی
کہ اس کے ساتھ ہیں جتنے، وہ سارے اپنے ہیں
بڑا ادارہ ہے اس کی دروغ گوئی کا
صداقتوں کے علاقے ہمارے اپنے ہیں

(3)

ہوئیں نزدیکیاں تو کیا ہوا ہے
تکلف درمیاں بیٹھا ہوا ہے
ملانے ہاتھ بھی تم ڈر رہے ہو
تمھیں شاید کہیں دھوکا ہوا ہے
بہت دن سے بہت خاموش ہے وہ
خدا جانے کہ اس کو کیا ہوا ہے
مرے گھر میں پری اُتری ہے شاید
مرا آنگن بہت مہکا ہوا ہے
زمانے تجھ سے کیا آکر ملوں میں
مجھے خود سے ملے عرصہ ہوا ہے

(4)

ساحل نہ سمندر نہ ہوا کچھ بھی نہیں ہے
خوابوں کے جزیرے میں رکھا کچھ بھی نہیں ہے
بارش نے گئے وقت کی تحریر مٹا دی
دیوار کے ماتھے پہ لکھا کچھ بھی نہیں ہے
سب زورِ سخن ختم ہوا نوحہ گری پر
جینے کے لیے حرفِ دعا کچھ بھی نہیں ہے
آنکھوں میں تمازت نہ چراغوں میں کوئی لو
آندھی سے اُلجھنے میں مزا کچھ بھی نہیں ہے
کاغذ کے سمندر میں سلگتی ہوئی کشتی
اب اس کے سوا خط میں لکھا کچھ بھی نہیں ہے

(5)

چار دن میں طور ہی اس کا نرالا ہوگیا
ساتھ وہ میرے رہا تو آئنہ سا ہوگیا
کیا مزا آئے گا اس بازیچۂ اطفال میں
وہ تو پہلی چال ہی میں آب دیدہ ہوگیا
سادہ لوحی کو کبھی سودا گری آئی نہیں
زندگی کی ہر تجارت میں خسارہ ہوگیا
چار سمتوں میں مری چیخیں بلکتی رہ گئیں
آسماں سفاک گونگا اور بہرا ہوگیا
دیدۂ بینا پہ اپنے جس کو محسنؔ زعم تھا
آئنہ خانے میں وہ آیا تو اندھا ہوگیا

شاہ حسین نہری

ہیں جھما کے عجب معانی کے
لفظ مجھ سے مجادلے میں ہیں

غزلیں

شاہ حسین نہری

(۱)

میں سانسوں کی اپنی روانی میں تھا
سمندر مرے ساتھ پانی میں تھا

کہاں پیر مجھ سا کوئی اس گھڑی
جواں مجھ سا کس دم جوانی میں تھا

یہ بے تہ مری تاک میں کیوں ہیں پھر
خدا، میں تری دید بانی میں تھا

میں ساتھ اپنا دیتا رہا آج تک
مگن اپنی ہی سخت جانی میں تھا

دعا دست کے ہاتھ کشکول کیوں
کہ میں شاہ کیا بس کہانی میں تھا

(2)

حمایت حق کی سننے میں تو ہوتی ہے جھجک اکثر
سنائے پھر بھی حق کوئی تو جاتے ہیں بھڑک اکثر
رہیں ناکام جب باتوں وغیرہ کے سبھی حربے
تو پھر سر کرتی ہے میدان آنسو کی کمک اکثر
منانے پر خوشی کے رنگ آنسو پونچھ دیتے ہیں
جو بارش ہو کے کھل جائے، نکلتی ہے دھنک اکثر
عمل کی جب بھی کوئی ناپسندیدہ سی شکل آئے
تو مفتی قلب کا محسوس کرتا ہے کھٹک اکثر
کسی کی واقعی تعریف کرتے شاؔہ کیوں جھجکے
جو تحسین اپنی نکلے، ہوتی ہے کہتے جھجک اکثر

(3)

دل کے کاغذ کو یوں نہ پھاڑ میاں
کچھ لکھا ہوگا دیکھ جھاڑ میاں
کیوں لڑھکنا زوال کی صورت
چڑھ عمودی کوئی پہاڑ میاں
روے الفاظ پر ہی کیا جینا
کچھ تو اندر سے اپنے کاڑ میاں
چلیے مسجد میں چل کے بیٹھتے ہیں
واں نہیں ہوتی بھیڑ بھاڑ میاں
ہے بگڑتی ہی شاہ بنتی بھی
کیا بناؤ ہے کیا بگاڑ میاں

(4)

جہاں سے اُس کے خود کو جوڑ کر دیکھو
چلو تارِ نفس کو توڑ کر دیکھو
سنو، اوقات جانو اپنی، بارش میں
ذرا کاغذ کی کشتی چھوڑ کر دیکھو
سبھی کچھ اپنے دل کے نام کر لینا
اُدھر کی سمت خود کو موڑ کر دیکھو
ہے اپنی عافیت تو رُخ پہ اپنے ہے
چلو جب بھی، تو رستہ چھوڑ کر دیکھو
ہیں آنکھیں، پھوٹ بہنے دو خشیت سے
کہ یہ کچے ہیں مٹکے پھوڑ کر دیکھو

(5)

صورت گر نورانی ہے
باطن کی سلطانی ہے
سر چہرے پر آگ سفید
عمری کارستانی ہے
قربت دوری بے معنی
اصل تو خوش اوسانی ہے
فکر و جذبہ کب محدود
ہر سو، پر افشانی ہے
ہر اک اپنے آپ میں گم
یوں تو آبادانی ہے

عتیق اللہ

یہ ارتعاش میرے ہی اندر کا عکس ہے
یا ٹوٹنے لگی ہیں رگیں کائنات کی

غزلیں

عتیق اللہ

(۱)

جو نظر نہ آسکیں ایسے بھی منظر دیکھیں
دیکھنے والے کبھی اپنے بھی اندر دیکھیں

وقت نے سب سے بڑا وار کیا ہے ہم پر
کس بلندی سے گراتا ہے مقدر دیکھیں

دیکھنا یہ ہے کہ کیا ردِ عمل ہوتا ہے
اپنے ہم زاد کو پہلو سے جھٹک کر دیکھیں

اتفاق ایسا بھی اک روز میسر آئے
دور سے اپنے کو حالات کی زد پر دیکھیں

دور افتادہ جزیرہ ہی نکل آئے کوئی
اُس کی آنکھوں کے سمندر میں اُتر کر دیکھیں

(2)

ایک اشتہار سا دیوار پر لگا کے مجھے
وہ کر گیا ہے بہت دور پاس لا کے مجھے
دکھا رہا ہے تر و تازہ پھل منڈیروں سے
کنویں کے گہرے خلا میں کوئی گرا کے مجھے
رگوں میں زہر بجھی سوئیوں کے ٹکڑے ہیں
یہ کس نے چھوڑ دیا ہے گلے لگا کے مجھے
نکل کے آئے تو چٹان گر پڑی ہم پر
وہ لے گیا تھا سرنگوں سے بچ بچا کے مجھے
پھنسا ہی تھا ابھی جادوگروں کے نرغے میں
کہ اِک پری اُڑی تخت پر بٹھا کے مجھے

(3)

جب بھی تنہائی کے احساس سے گھبراتا ہوں
میں ہر اک چیز میں تحلیل سا ہو جاتا ہوں
میں کسی جسم پہ پھینکا ہوا پتھر تو نہ تھا
بارہا اپنا لہو، دیکھ کے شرماتا ہوں
رات جو کچھ مجھے دیتی ہے سحر سے پہلے
وقت کے گہرے سمندر میں اُتار آتا ہوں
دن کے ہنگامے جلا دیتے ہیں مجھ کو ورنہ
صبح سے پہلے کئی مرتبہ مر جاتا ہوں
ایک نشے کی طرح ٹوٹ گیا ہوں خود سے
اپنے نزدیک بھی مشکل سے نظر آتا ہوں

(4)

اتنی آساں تو نہیں زیست کہ راس آ جائے
ان پہاڑوں سے کبھی کود کے دیکھا جائے
ہم زمینوں پہ نہیں زیرِ زمیں ہوں جیسے
ایک سناٹا رگ و پے میں اُتر تا جائے
آج کے کاٹھ کے گھوڑے پہ بھریں اونچی اُڑان
کل کے ہر خواب کو الماری میں رکھا جائے
انتظار ایسا کہ اِک عمر بھی ہو تو کم ہے
انتشار ایسا کہ اک پل بھی نہ ٹھہرا جائے
چیختا ہے مرے اعصاب میں دھرتی کا بدن
کتنا پیاسا ہوں مجھے کھود کے دیکھا جائے

(5)

ایسا سناٹا کہ آواز نہ آئے کوئی
چیخنا چاہے مگر چیخ نہ پائے کوئی
سرکٹے سائے مرے گھر میں چھپے ہیں اور میں
جیسے سگریٹ کے مرغولے اڑائے کوئی
گھر کی دیوار پہ اک نقش بنا ہے ایسا
جیسے اک جھیل ہو اور ڈوبتا جائے کوئی
کارٹونوں کی طرح لوگ نظر آتے ہیں
آدمی دوسرا جادو سے بنائے کوئی
عمر سرکس کے کسی شیر کے مانند کٹی
تازیانوں کے نشاں کیسے مٹائے کوئی

احمد سوز

نیند بھی کرتی ہے حیران بہت
آدمی چین سے کب سوتا ہے

غزلیں

احمد سوز

(۱)

میں کہ خود کو کھنگالنے پر ہوں
دشت اپنا جمالنے پر ہوں

میری ہٹ لسٹ پر فلک بھی ہے
میں اسے بھی سوالنے پر ہوں

کولھتی کو پڑوستا ہوں ہوا
سارا لاوا اُبالنے پر ہوں

چارۂ سخت ہے مرے آگے
پتھروں کو جگالنے پر ہوں

یاوہ گویوں کی بھیڑ ہے مجھ میں
سب کو باہر نکالنے پر ہوں

(2)

اس کا عاشق مت ہونا رے
ہنستے رہنا مت رونا رے
سونے والا سوجاوے ہے
جاگتے رہیو مت سونا رے
گیہوں چاول بھی ہے بونا
پیار دلوں میں بھی بونا رے
ماں یہ شاید سچ کہتی ہے
روپ اس کا جادو ٹونا رے
پیاسی ہے یہ ساری دھرتی
گر جو ہو تو برسو نا رے

(3)

بدن تحلیل ہونا چاہتا ہے
ہے زخمی ہیل ہونا چاہتا ہے
دکھانا چاہتا ہوں سب کو سب میں
تماشا ریل ہونا چاہتا ہے
ابھی انکوائری کا مرحلہ ہے
یہ سودا ڈیل ہونا چاہتا ہے
مری انگشتری رکھ لی ہے اُس نے
لفافہ سیل ہونا چاہتا ہے
ہوا ہے دیر سے معلوم مجھ کو
وہ میلوں میل ہونا چاہتا ہے

(4)

میرے زانو سوئے تھی وہ
کل شب کتنا روئے تھی وہ
چومے لپٹ کے چوم کے لپٹے
کیا کیا پاگل ہوئے تھی وہ
مہک اُٹھا تھا میں پھولوں سا
خوشبو مجھ میں بوئے تھی وہ
اسی گلی نے لوٹا تھا کل
اسی گلی میں کھوئے تھی وہ
میں کہ بھول چکا تھا اُس کو
مجھے ابھی تک ڈھوئے تھی وہ

(5)

لہو کی گردشوں میں شور کرتا ہے
مجھے اکثر وہ اپنی اُور کرتا ہے
شعور و آگہی بھی کچھ نہیں کرتے
کبھی انسان بدن کو ڈھور کرتا ہے
کبھی اٹھکیلیاں کرتا ہے موسم بھی
گھٹاؤں کو کبھی گھنگھور کرتا ہے
رُلاتی ہے مجھے بد صورتی میری
کروں میں بھی وہی جو مور کرتا ہے
کبھی تو نیند بھی شب بہلتی ہے
کبھی تو دن بھی اکثر بور کرتا ہے

صادقؔ

ورنہ تم کو یہ دبوچے گا ابھی
خوف کو چیخ بنا دو لوگو!

غزلیں

صادقؔ

(۱)

بچھڑا ہر ایک فرد بھرے خاندان کا
یہ مجھ کو شاپ لگ گیا کس بے زبان کا

قدموں تلے تھے جتنے سمندر سرک گئے
اب کیا کروں گا دیکھ کے منھ بادبان کا

میرے وجود کے کوئی معنی نہیں رہے
تیکھا سا ایک تیر ہوں ٹوٹی کمان کا

جب سے ہوا ہے راج پشاچوں کا شہر پہ
جنگل میں ہم کو خوف نہیں اپنی جان کا

میں نے اٹھائے ہاتھ دعا کے لیے مگر
لاشہ زمیں پہ آن پڑا آسمان کا

(2)

پھر سے لہو لہو در و دیوار دیکھ لے
جو بھی دکھائے وقت وہ نا چار دیکھ لے
اپنے گلے پہ چلتی چھری کا بھی دھیان رکھ
وہ تیز یا ہے کند ذرا دھار دیکھ لے
پھر چھوٹنے سے پہلے ہی اپنے وجود کو
موجود بچپنوں میں گرفتار دیکھ لے
گھستا چلا ہے پیٹ میں ہر آدمی کا سر
تجھ سے بھی ہو سکے گا نہ انکار دیکھ لے
یوں روز روز کرتے اداکاریاں تری
صورت بدل گئی ہے مرے یار دیکھ لے

(3)

میں پرتھوی اُلانگھ کے تیری پکار پر
پھر آ کھڑا ہوا ہوں سفر کے کگار پر
وعدے پہ تیرے گرد کی تہہ ہے جمی ہوئی
جالے تنے ہوئے ہیں مرے انتظار پر
ہے وسعتوں پہ آنکھ تو پاؤں رکاب میں
پر میرا بس نہیں ہے ترے اختیار پر
وہ سوگ وار جھوٹی تسلی پہ خوش ہوا
بھرپور غم نے وار کیا غم گسار پر
اپنی بلندیوں کی پتاکا ذرا سنبھال
پتھر ہوس کے پھینک نہ کچے انار پر

(4)

روپ بدلتی مایا کے سو چہرے جاتے آتے
کایا لے کر مٹی کی ہم کیا کھوتے کیا پاتے
دھیرے دھیرے ہستی کی سب خاک جھڑی جاتی تھی
کچے برتن، آخر کب تک، روحوں کو ڈھو پاتے
اک وزنی پربت کے نیچے صبح دبی تھی اپنی
تتر بتر سپنوں کو لے کر رات کہاں بسراتے
جو کچھ سچ تھا، اپنے اندر تک وہ پیٹھ گیا ہے
لہریں سانسوں کی گزریں گی دکھ سہتے، غم کھاتے
ہم آندھی میں اکھڑے پودے اور اتہاس ہمارا
اتنا ہی ہے دھرتی سے چُھٹ کر کس کو اپناتے

(5)

نہیں فائدہ کوئی تدبیر سے
گلا کاٹ بچپن کا شمشیر سے
سراپا نہ لے جائیں آنکھیں سنبھل
بدن ڈھانپ لے برگ انجیر سے
ستاروں کو زینہ بنا اور چڑھ
عبث خوف کھاتا ہے تقدیر سے
کسی خشک جنگل کو آواز دے
ندی باندھ کر ایک زنجیر سے
تری کھوج میں ہیں زمان و مکاں
نکل بھاگ مٹی کی تصویر سے

وحید واجد

سودے بازی میں سبھی مصروف ہیں
کیا سخی ، کیا متقی بازار میں

غزلیں

وحید واجد

(۱)

میری یادوں کے شبستاں میں رہو کافی ہے
یا اچانک کبھی خوابوں میں ملو کافی ہے

کون کہتا ہے قصائد پہ قصائد لکھو
مجھ کو جاں باز وفادار لکھو کافی ہے

کیل کانٹوں سے الجھنے سے تو بہتر ہے یہی
صحنِ گلشن میں گرے پھول چنو کافی ہے

ساری مخلوق کے بارے میں پریشاں کیوں ہو
اپنے ماں باپ کی خدمت ہی کرو کافی ہے

میری باتوں کا کبھی اتنا اثر مت لینا
یوں ہی دل رکھنے کوئی بات سنو کافی ہے

(2)

راہ میں جو موم کے پیکر ملے
زندگی کی دھوپ کی زد پر ملے
کانچ کی منزل کے جو رہبر ملے
اُن کے ہاتھوں میں ہمیں پتھر ملے
جب بڑھے محلِ تصور کی طرف
یاد کے بڑھتے ہوئے لشکر ملے
کیا سنائیں شہر کی روداد ہم
کانچ کے ٹکڑے ہمیں گھر گھر ملے
بٹ رہا تھا پھول کی مانند جو
رات اس کو خار کے بستر ملے

(3)

سبھی نا واجبی دن رات کیسے بھول سکتا ہوں
تمھارے پیار کی سوغات کیسے بھول سکتا ہوں
وہ جو کچھ بھی رہے ہوں سب تمھارے ساتھ گذرے ہیں
وہ اچھے کہ برے حالات کیسے بھول سکتا ہوں
تباہی لانے والی بارشیں تو بھول جاؤں گا
مگر اُن آنکھوں کی برسات کیسے بھول سکتا ہوں
سجا رکھے ہیں سب محرابِ دل میں بے وفا تیرے
جفاؤں کے سبھی دن رات کیسے بھول سکتا ہوں
وہ انتظار کے لمحے جو صدیوں کے مماثل تھے
وہ سارے قیمتی لمحات کیسے بھول سکتا ہوں

(4)

پر ہول ہواؤں سے چمن چیخ رہے ہیں
ہر شاخ پہ غنچوں کے ذہن چیخ رہے ہیں
بہروں کی طرح اس کا رویہ ہے ابھی تک
گونگوں کی طرح اہلِ سخن چیخ رہے ہیں
پتھر کئی چہروں کا گلا گھونٹ رہا ہے
شیشے کی طرح کتنے بدن چیخ رہے ہیں
شہروں نے بھی سمندر کا بھی اغوا کیا ہوگا
پانی کے تعاقب میں ہرن چیخ رہے ہیں
اک شے کوئی شیشے کی بلندی سے گری ہے
اک محل میں پتھر صحن چیخ رہے ہیں

(5)

سفید جھوٹ کا لوشن شباب کیا دے گا
ضعیف سوچ کو کالا قضاب کیا دے گا
یہ جو عذاب ہے یہاں سہہ رہا ہوں روزانہ
وہاں وہ اس سے زیادہ عذاب کیا دے گا
لباس آپ میں خود ڈھونڈتا ہے پانی کو
سراب پیاسے غزالوں کو آب کیا دے گا
دراز قد سبھی اس کے پہنچ سے باہر ہیں
دراز قد کو یہ بونا خطاب کیا دے گا
چراغ اس سے کئی لاکھ درجے بہتر ہے
سوائے دھوپ مجھے آفتاب کیا دے گا

قطب سرشارؔ

ہزاروں سال سے مجرم ہی سرخرو ٹھہرے
بھلا یہ جرم کا عرصہ معاف ہے کتنا

غزلیں

قطب سرشارؔ

(۱)

جو اپنے آپ سے خائف تھے لازماً تر سے
وگرنہ دُور کہاں ہے زمین ساگر سے

سفر بلند ہے پرواز بھی سماوی ہے
فلک کو چھو لیا جوں ہی نکل پڑے گھر سے

اُبھرنے لگ گئے منظر ردائے ظاہر پر
لگی ہیں پھوٹنے کرنیں جو تیز اندر سے

شکستگی تھی ، چھناکا تھا یا تکلم تھا
غبارِ نشہ اُبھر آیا قلب مضطر سے

کمالِ ذوق ہے یہ نشۂ شہادت بھی
خمارِ زخم ٹپکتا ہے نوکِ خنجر سے

(2)

مرے لیے نہیں تنہائی کے لیے گھر ہو
تراشنے کے لیے آگہی کا پتھر ہو
دل و نگہ پہ عجب دُھندسی ہے چھائی ہوئی
کوئی تو شعلہ صفت روشنی کا خوگر ہو
غموں کی ریت پہ اُمید کے گھروندوں سے
ذرا قریب ، مسرت کا اِک سمندر ہو
ہمارے چہرے پہ غنچے چٹک رہے ہوں گے
تمھارے ہاتھ میں تلوار ہو کہ پتھر ہو
وہ جس سے کاٹ سکیں ظلمتوں کے شہ رگ کو
ہمارے ہاتھ میں سرشار ایسا نشتر ہو

(3)

بارِ گنہ اُٹھا نا تھا پتھر اُٹھا لیے
شیشہ ہے رُوبرو ذرا خود کو سنبھالیے
پگڑی اُچھالتے رہے اوروں کی آج تک
اپنی بھی ذات پر ذرا کیچڑ اُچھالیے
موجوں کا اضطراب ہمیں ایسا بھا گیا
ساحل پہ ہم نے چند گھروندے بنا لیے
مفہومِ رزم امن سے بدلا نہ جا سکا
صدیوں سے کاغذوں کے کبوتر اُڑا لیے
یوں گھومتے ہیں سڑکوں پہ فرعون بے خطر
جیسے خدا نے سارے صحیفے اُٹھا لیے

(4)

کتاب تھامے ہوئے ہے ہر ایک فرد یہاں
کسے وثوق سے میں صاحبِ کتاب کہوں
یہاں پہ لوگ جسے زندگی سمجھتے ہیں
میں سانس لینے کی تکرار کا عذاب کہوں
یہ اعتراض ہے مجھ پر کہ سچ نہیں کہتا
اگر ہو تابِ سماعت تو پھر جناب کہوں
کہیں بھی پیار کی کشتی رواں نہیں ہے یہاں
جہاں کو بحر سمجھ لوں کہ سراب کہوں
گلاب و نرگس و لالہ ہیں ایک ڈالی پر
حسین جسم کو پھولوں کا انتخاب کہوں

(5)

زندگانی کی ہوس میں مر گئے
وہ جو اپنے خول سے باہر گئے
اس طرح دہلا گئی بے چہرگی
آئنہ دیکھا تو فوراً ڈر گئے
زندگی کا ان کو کتنا درک ہے ؟
وہ جو میرے حال پر ہنس کر گئے
تشنگی کا دل میں آتے ہی خیال
دفعتاً آنکھوں کے پیالے بھر گئے
آئنہ اس نے مقابل کر دیا
تم جو ہاتھوں میں لیے پتھر گئے

فہیم احمد صدیقی

رستہ نہیں ہے گویا کتب خانہ ہے کوئی
ہم چلتے چلتے کتنی کتابوں کو پڑھ گئے

غزلیں

فہیم احمد صدیقی

(۱)

ہر سمت جگمگاتا وہ پیکر نہیں ملا
گلیوں میں شب کے خواب کا منظر نہیں ملا

جلوہ گری کو مجھ میں تڑپتی رہی حیات
وہ سنگ ہوں جسے کوئی آزر نہیں ملا

ہے کتنا اختیار اُسے اپنے آپ پر
خواب و خیال میں بھی وہ کھل کر نہیں ملا

رستوں کی نیند اُڑ گئی قدموں کی چاپ سے
مجھ کو تمام رات مرا گھر نہیں ملا

دیکھا تو اس جگہ میں تصرف کسی کا ہے
اپنا وجود اپنے ہی اندر نہیں ملا

(2)

جیتے جی ایسے بھی کیا جاں سے گزر جانا تھا
مجھ سے وعدہ جو کیا تھا تو مکر جانا تھا
حوصلے ٹوٹ گئے اب کے اسی پاران کے
جن کو اس دریا کے اُس پار جانا تھا
بے رُخی اتنی بھی کیا بچھڑے ہوئے ساتھی سے
دل نے آواز جو دی تھی تو ٹھہر جانا تھا
اب وہ آشفتہ سری ہے نہ وہ بیگانہ روی
ایسے جینے سے تو بہتر ہے مرا مر جانا تھا
بے ارادہ تو نکلتا نہیں گھر سے کوئی
راستے تو ہی بتا مجھ کو کدھر جانا تھا

(3)

دل میں رہ کر بھی نگاہوں سے چھپا رہتا ہے
کون ہے یہ جو بہ اندازِ خدا رہتا ہے
اس کی کھڑکی پہ بھی مکڑی نے بنے ہیں جالے
میری آنکھوں پہ بھی اب پردہ پڑا رہتا ہے
ریت ہی ریت ہے پانی کی تہوں میں اُترو
ہر سمندر میں کوئی دشت چھپا رہتا ہے
ساتھ جب چھوڑ چکا ربط ہر اک توڑ چکا
کیوں مرے حق میں وہ مصروفِ دعا رہتا ہے
ہم نے کلیوں کے چٹکنے کو بھی دیکھا ہے فہیمؔ
اس کا اندازِ تبسم ہی جدا رہتا ہے

(4)

ہر کرب آنکھوں میں چہروں پہ اک اُداسی ہے
ہمارے عہد کی پہچان بد حواسی ہے
تمام عمر مناتے رہے ، نہ جانے کیوں
حیات آج بھی ہم سے خفا خفا سی رہتی ہے
میں جان بوجھ کے خود کو فریب دیتا ہوں
مجھے پتہ ہے مری ہر خوشی قیاسی ہے
دعا کسی کی بچاتی ہے تیز دھوپوں سے
تنی ہوئی مرے سر پر کوئی ردا سی ہے
تبھی تو آ کے پٹکتی ہے سر، کنارے پر
ہر ایک موج سمندر میں رہ کے پیاسی ہے

(5)

میرے خلوص و کرب کو پہچانتا نہ تھا
آخر وہ ایک شخص تھا ، کوئی خدا نہ تھا
سوکھی ہوئی جڑوں کے سہارے درخت تھے
جنگل میں پیڑ پہ کوئی پتا ہرا نہ تھا
غوطہ لگا کے ڈوب گئے بحرِ ذات میں
گہرائیاں تھیں اتنی کہ تہہ کا پتہ نہ تھا
مصروفیت نہیں تھی کوئی اور ہجر میں
ورنہ تمھیں بھلانا کوئی مسئلہ نہ تھا
میں کس سے ساری رات رہا محو گفتگو
کمرے میں کوئی اور تو میرے سوا نہ تھا

رؤف خیرؔ

اب آسمان سے بہتر کوئی زمین نہیں
کہاں میں کر کے بھلا ترکِ مستقر جاتا

غزلیں

رؤف خیرؔ

(۱)

نیت میں کھوٹ سر میں خلل تو نہیں کوئی
وہ حیلہ جوے جنگ و جدل تو نہیں کوئی

دنیا تمام یوں تو بڑی مہربان ہے
تیری عنایتوں کا بدل تو نہیں کوئی

میری گزر بسر ہے دلیل وجواز پر
اس رہ گزر میں لیت ولعل تو نہیں کوئی

اوروں کو مارنے کے لیے مر رہا ہے وہ
اس کے دماغ کا یہ خلل تو نہیں کوئی

کیسی عمارتیں تھیں جو ڈھانچے میں ڈھل گئیں
کردار اس میں نذرِ اجل تو نہیں کوئی

(2)

بھلے ہی ہوتی ہے دنیا تمام ہو، ہو جائے
خدانخواستہ میرے خلاف تو ہوجائے
میں اپنا فون کبھی بند ہی نہیں رکھتا
نہ جانے کب اسے توفیق گفتگو ہوجائے
تمہاری چشم کرم ہی سے ہے بھرم دل کا
وہ دن نہ آئے کہ یہ جام، بے سبو ہوجائے
ملے ملے نہ ملے فرصت و فراغت پھر
چلو یہیں کہیں کچھ دیر ہاؤ ہو، ہو جائے
دماغ اس کا سنا ہے کہ آسمان پہ ہے
مری زمیں پہ چل کر لہو لہو ہوجائے

(3)

بچھا ہوا ہے زمین رنگ جال سا کوئی
ہے آسمان بھی ہم پر وبال سا کوئی
لگا ہوا ہے ازل سے مرے تعاقب میں
کبھی عروج سا کوئی زوال سا کوئی
جوخوش جمال بھی ہے اور ہم خیال بھی ہے
مرے لیے تو ہے مال و منال سا کوئی
ادھر اُدھر کی حکایات بے سند نہ سنا
سخن سنا تو سہی حسب حال سا کوئی
رؤف خیر ہمارا کمال چبھتا ہے
پڑا ہے یاروں کی آنکھوں میں بال سا کوئی

(4)

گرفتاری کے سب حربے شکاری لے کے نکلا ہے
پرندہ بھی شکاری کی سپاری لے کے نکلا ہے
کھلونے کی تڑپ میں خود کھلونا وہ نہ بن جائے
مرا بچہ سڑک پر ریز گاری لے کے نکلا ہے
اگر دنیا بھی مل جائے رہے گا ہاتھ پھیلائے
عجب کشکول دنیا کا بھکاری لے کے نکلا ہے
خطا کاری مری امیدوار دامن رحمت
مگر مفتی تو قرآن و بخاری لے کے نکلا ہے
جھلکتا ہے مزاج شہریاری ہر بن مو سے
بظاہر خیرؔ حرفِ خاکساری لے کے نکلا ہے

(5)

وہ آسمان پہ ہر چند چاند سا بھی ہے
حسین چاند میں داغوں کا سلسلہ بھی ہے
وہ اپنی بات پہ قائم کبھی نہیں رہتا
مشاہدہ ہی نہیں ہے یہ تجربہ بھی ہے
ہمارے رنگ پہ چڑھتا نہیں ہے رنگ کوئی
وہ اپنے رنگ میں رنگنا جو چاہتا بھی ہے
شناوری کا کم از کم نہ کر کوئی دعوا
سمندروں سے تعارف اگر ذرا بھی ہے
رؤف خیرؔ جو دستور ساز تھا کل تک
سنا ہے آج وہ دستور سے خفا بھی ہے

سلیمان خمارؔ

کل تلک چھایا ہوا تھا ماتمِ بے چہرگی
آج نیزوں پر اچانک سر کہاں سے آ گئے

غزلیں

سلیمان خمارؔ

(۱)

نہ شہر میں نہ گلی میں نہ گھر میں رہتا ہے
وہ میرے ساتھ ہمیشہ سفر میں رہتا ہے

قدم قدم پہ اُگاتا ہے پیڑ راحت کے
وہ چھاؤں بن کے مری رہ گزر میں رہتا ہے

بیاضِ شام میں رہتا ہے وہ غزل کی طرح
مثالِ حمد کتابِ سحر میں رہتا ہے

مجھے سرور اُسی کا ہے وہ نشہ بن کر
مرے وجود کے دیوار و در میں رہتا ہے

وہ میرے جسم میں رہتا ہے اس طرح شب روز
کہ سایہ جس طرح چھپ کر شجر میں رہتا ہے

(2)

کوئی بستی نہ کوئی کوچہ نہ در ہے اُس کا
وہ تو رہتا ہے مرے دل میں کہ گھر ہے اُس کا
بات یہ ہے وہ نہیں ملتا کسی سے کھل کر
بات یہ ہے ذرا انداز دگر ہے اُس کا
عشق محبوب میں اک بار بہے تھے آنسو
دامنِ یاد مگر آج بھی تر ہے اُس کا
نام لیتے ہی مہکتے ہیں در و بام وجود
میرے احساس کی رگ رگ پہ اثر ہے اُس کا
عمر گزری وہ نہیں آیا میرے گھر، پھر بھی
انتظار آج تلک شام و سحر ہے اُس کا

(3)

کوئی دیا کسی چوکھٹ پہ اب نہ جلنے کا
سیاہ رات کا منظر نہیں بدلنے کا
وہ رُت بدل گئی سب سے قریب رہنے کی
زمانہ ختم ہوا سب کے ساتھ چلنے کا
لو اپنے جرم کا اقرار کر رہے ہیں ہم
ہنر نہ آیا ہمیں بات کے بدلنے کا
کسے ہے آرزو تنہائیوں میں جلنے کی
کسے ہے شوق کسی کے لیے پگھلنے کی
یہ چاہتوں کا بھنور ہے سوائے موت خمارؔ
نہیں ہے راستہ باہر کوئی نکلنے کا

(4)

تسکینِ قلب و جاں کا سبب کون لے گیا
بستی کی محفلوں سے ادب کون لے گیا
کیوں طائرِ خیال کو آنے لگی ہے نیند
پرواز کا وہ لطفِ عجب کون لے گیا
تھکتے نہیں تھے دوری منزل سے ہم کبھی
وہ لذتِ مسافتِ شب کون لے گیا
وحشت برس رہی ہے یہاں ہر مکان پر
آسودگیِ شہرِ طرب کون لے گیا
اس دورِ پرفتن میں متاعِ وفا خمارؔ
کھلتا نہیں کسی پہ کہ کب کون لے گیا

(5)

جس نے میری راتوں کو تنہایا ہے
حد ہے اسی کو آنکھوں نے سپنایا ہے
تیری یاد کے ٹھنڈے ٹھنڈے جھونکوں نے
کیسے جھلستے موسم کو برفایا ہے
کس کے پاس ہیں رہن ہماری مسکانیں
کس نے ساری خوشیوں کو اغوایا ہے
ایک اداسی ارمانوں کو لے ڈوبی
اک اندیشہ جذبوں کو سردایا ہے
موسم موسم ایک ہی بے لطفی ، یعنی
لمحوں نے ہر لذت کو کہرایا ہے

راہیؔ فدائی

ذرا تو سوچ یہ بھی کوئی سزا تو نہیں
دعاے خیر سہی پھر بھی ساری رات نہ مانگ

غزلیں

راہیؔ فدائی

(۱)

باعثِ ننگ و نام کام نہ کر
کعبۂ دل کا انہدام نہ کر

عکس و خواب و سراب سے نفرت
خود پہ نعمت کو یوں حرام نہ کر

خصم پر بزدلی عیاں ہو گی
غیر سنجیدہ اژدہام نہ کر

دل دریچے کھلیں گے لوح طرف
درمیانِ حواس شام نہ کر

راہیؔ بے نوا سے کیا ہے غرض
بات اس سے نہ کر، سلام نہ کر

(2)

بطنِ گیتی میں آسمان نہیں؟
قابلِ اعتنا بیان نہیں
بے سبب جسم شعلہ پوش ہوئے
آتشیں پا کا کچھ نشان نہیں
در و دیوار سن کے ہنس دیں گے
کیوں یہ کہتے ہو، گھر کے کان نہیں
جان لیوا مسافتوں کی پیاس
طائرِ عزم سخت جان نہیں
فکر تاباں کی پیش کش راہیؔ
مار و کژ دم کا ارمغان نہیں

(3)

شہریارِ شر کی یہ تاکید ہے
کُن مرا نا قابلِ تردید ہے
ذہن میں ہیں مار و کژدم خوف کے
دل میں روشن کرمکِ امید ہے
جس لہو میں شر کا جرثومہ نہیں
وہ فرشتہ زندۂ جاوید ہے
اک مفصل داستاں ہے کائنات
دل کی دنیا مختصر تمہید ہے
معجزاتی شعر راہیؔ نے کہے
بالیقیں اللہ کی تائید ہے

(4)

برگشتگانِ شاہ میں شامل نہ ہو سکے
ہم اس خطاب خاص کے قابل نہ ہو سکے
احباب کے لیے ستم ایجاد تھے مگر!
دشمن کے حق میں وجہِ مفاصل نہ ہو سکے
دیوار اٹھائی ہم نے کہاں خیر و شر کے بیچ
شکرِ خدا کہ نقطۂ فاصل نہ ہو سکے
باقی صداقتیں تو فقط عذرِ لنگ ہیں
تم خود حریف پنجۂ قاتل نہ ہو سکے
راہیؔ رہینِ منت منزل نہیں رہا
ابنائے راہ بھی تو منازل نہ ہو سکے

(5)

ڈرا، سہما عدو بیٹھا ہوا ہے
کہ میرے دل میں ''تو'' بیٹھا ہوا ہے
خموشی کو لبھانے حرفِ رنگیں
میانِ گفتگو بیٹھا ہوا ہے
مرے اشعار کا واحد مخاطب
مرا ''میں'' روبرو بیٹھا ہوا ہے
حقیقت چپ کھڑی ہے من کی تہہ میں
تصنع مو بہ مو بیٹھا ہوا ہے
ہمیں جس کی ضرورت ہے ہر اک پل
وہی تو چار سو بیٹھا ہوا ہے

حامد اکمل

یہ کون مجھ کو صلیبوں سے دے رہا ہے صدا
ثباتِ مرگ! میں کب سے تری پناہ میں ہوں

غزلیں
حامد اکمل

(۱)

رنگ ایک آسمان پر دیکھا
ذائقہ اک زبان پر دیکھا

اس نے مجھ کو یقین میں پایا
جس کو میں نے گمان پر دیکھا

فتح کا طبل بجنے سے پہلے
تیری ٹوٹی کمان پر دیکھا

کیا ہے فکرِ رسا نہیں معلوم
ہاں قلم اس کے کان پر دیکھا

دھند کیسی بسی ہے آنکھوں میں
اک دھواں ہر مکان پر دیکھا

(2)

مشتاق تھے ہم جس کے کبھی آ پہنچا
لو عرصۂ گمشدگی آ پہنچا
خاموشی ہے یوں تری جدائی کا خیال
جب محفل احباب سجی آ پہنچا
جا پہنچا کبھی طور پہ موسیٰ کی طرح
طاری کیے خود پہ ہی غشی آ پہنچا
صدیوں سے جسے اپنے لہو میں پایا
وہ معرکۂ جاں طلبی آ پہنچا
پھر بارگہِ ناز پہ شکرانے کو
دیوانہ بہ اندازِ شہی آ پہنچا

(3)

یہ ایک حرفِ تمنا سزا سا لگتا ہے
مجھے تو تُو بھی کسی کی دعا سا لگتا ہے
اگرچہ اس کی عنایات بھی بہت سی ہیں
زمانہ پھر بھی بہت بے وفا سا لگتا ہے
میں جب بھی دیکھوں اسے مسکرا کے جیتے ہوئے
مجھے خلیفہ خدا کا خدا سا لگتا ہے
فرازِ دار سے دیکھو بدل رہی ہے رُت
ہر ایک نخلِ تمنا ہرا سا لگتا ہے
اسے منانے کی اکمل کوئی سبیل نہیں
ہماری طرح وہ خود سے خفا سا لگتا ہے

(4)

ساری تعبیروں سے واقف خواب تھا
دل ، وفورِ شوق میں بے تاب تھا
طے ہوا ہے یوں سرابوں کا سفر
اک قدم تشنہ تھا، اک سیراب تھا
وہ سفینہ بھی ہوا ساحل نصیب
جو ابھی تک نازشِ گرداب تھا
اس کا ماتم بے صدا شورِ سکوت
وہ رگِ جاں کے لیے مضراب تھا
حامد اکمل فکر و جذبہ بہہ گئے
قافیوں کا بھی عجب سیلاب تھا

(5)

چھوٹی سی اک خبر کہ وہ کل رات مر گیا
حالانکہ دوستوں سے ملا اور گھر گیا
شاید کہ ہم پہ سب کے گناہوں کا بوجھ تھا
ڈوبے جو ہم ، سفینہ کنارے اُتر گیا
تصویر، اپنی ویسے بھی کم پر کشش نہ تھی
لیکن ترا خلوص نیا رنگ بھر گیا
پامالی سفر کا فسانہ رقم ہوا
کیسی اُڑی یہ دُھول کہ چہرہ نکھر گیا
احساس کی صلیب پہ لٹکے ہوئے ہیں لوگ
منظر سمیٹ لو کہ بدن تو بکھر گیا

رؤف صادق

تھا اتفاق سب کو مگر گفتگو کے بیچ
اک لفظ تھا جو کتنے ہی معنوں میں بٹ گیا

غزلیں

رؤف صادق

(۱)

اپنی جانب ہے ہر سفر میرا
مجھ میں ہے مطمع نظر میرا

آئنہ زندگی کا تم جوڑو
ریزہ ریزہ سمیٹ کر میرا

کتنی صدیاں گزر گئیں جانے
ایک لمحے کا تھا سفر میرا

جو کسی کو نظر نہیں آتا
ہے وہی مرکز نظر میرا

جب سے قدموں میں چھپ گئے سائے
جلتا سورج ہے اور سر میرا

(2)

ٹمٹماتا دیا سا لگتا ہے
چہرہ چہرہ بجھا سا لگتا ہے
سرنگوں شاخ آرزو پہ ابھی
ایک پتا ہرا سا لگتا ہے
ہر جبیں پر کوئی عبارت ہے
تربتوں پر لکھا سا لگتا ہے
جب سے جینے کی آرزو جاگی
لمحہ لمحہ فنا سا لگتا ہے
خاموشی پر ہے کیوں گلا ان کو
کچھ کہوں تو برا سالگتا ہے

(3)

زندگی کس کے پاس ہے بابا
ایک خالی گلاس ہے بابا
تم ارادوں کو شکل دے دینا
وقت چہرہ شناس ہے بابا
ننھے ہاتھوں سے چھین لو ماچس
ساری بستی کپاس ہے بابا
فیصلہ موت کا سناتے ہو
زندگی کس کو راس ہے بابا
ان کا ملنا تو اب نہیں ممکن
پھر بھی ملنے کی آس ہے بابا

(4)

ایک وحشت سہی مگر ہے تو
شکر ہے کو ئی ہم سفر ہے تو
مجھ سے وہ اختلاف رکھتا ہے
شہر میں کوئی معتبر ہے تو
زندگی ترجماں ہے صدیو ں کی
ایک لمحہ کی بھی اگر ہے تو
فیصلہ معتبر ہی ٹھہرے گا
سارے حالات پر نظر ہے تو
کل نتائج نکل کے آئیں گے
زندگی آج بے ثمر ہے تو

(5)

مجھ کو وہ بت شناس دیتا کیا
ماورائے قیاس دیتا کیا
میں بھی یادِ شمیم بن جاؤں
اپنی زلفوں کی باس دیتاکیا
فکر کے گھاو دے دیے مجھ کو
اور چہرہ شناس دیتا کیا
میری مٹھی میں تھا بھرم میرا
میں کسی کو قیاس دیتا کیا
تجربوں کے عوض مجھے کوئی
ایک پل کی مٹھاس دیتا کیا

نورالدین نوؔر

لوگ انعام چھین لیتے ہیں
تو بھی میرے لیے سزا بن جا

غزلیں

نورالدین نوؔر

(۱)

فکر آلود عذابوں کے سوا کیا دیتے
فلسفے چند کتابوں کے سوا کیا دیتے

آ کے دہلیز سے باہر ہی کوئی لوٹ گیا
ہم تہی دست دعاؤں کے سوا کیا دیتے

آپ کی سمت سے آئے ہوئے پتھر سارے
شیشۂ دل کو خراشوں کے سوا کیا دیتے

لوگ تو لوگ تھے اوتار و پیمبر تو نہ تھے
بے گناہی پہ سزاؤں کے سوا کیا دیتے

ہم جہاں بھی رہے آئینہ کی صورت ہی رہے
نوؔر خوش رنگ اُجالوں کے سوا کیا دیتے

(2)

خودی نے ورغلایا سجدہ گاہوں تک چلے آئے
انا کی قید سے نکلے گناہوں تک چلے آئے
وہ خواہش جس کے بارے میں کوئی بھی سچ نہیں کہتا
اسی دیرینہ خواہش کی پناہوں تک چلے آئے
شعور و فہم کی دیمک زدہ بیساکھیاں لے کر
تمھارے شہر کی مصروف راہوں تک چلے آئے
رسول امن کا اعزاز پانے کی تمنا میں
ہمارے حوصلے بھی قتل گاہوں تک چلے آئے
وہ لمحے جن کی خاطر نورؔ ہم نے زندگی کھوئی
شبِ غم چاندنی بن کر نگاہوں تک چلے آئے

(3)

لکیریں یک نہ یک تصویر بنتی جا رہی ہیں
رسیلی پتلیاں زنجیر بنتی جا رہی ہیں
اُترتا آرہا ہے ہر طرف رانجھوں کا موسم
منقش تتلیاں اب ہیر بنتی جا رہی ہیں
تمھاری احتراق انگیز سانسوں کی بدولت
میری سوچیں بھی آتش گیر بنتی جا رہی ہیں
نئے ملبوس آلودہ ہیں آلودہ رہیں گے
پرانی دھجیاں تفسیر بنتی جا رہی ہیں
ہماری لہلہاتی جھومتی نوخیز فصلیں
صلیب و دار کی تقدیر بنتی جا رہی ہیں

(4)

وہ امتیاز عیب و ہنر کون لے گیا
آنکھوں سے آبِ ذوق نظر کون لے گیا
اک برف کی چٹان کی صورت کھڑے ہیں سب
اُن کے لہو سے برق و شرر کون لے گیا
دستِ دعا میں ریت کے ذرے ہیں آج بھی
سوکھے ہوئے لبوں سے اثر کون لے گیا
سورج کی روشنی بھی سیاہی بدوش ہے
روے فلک سے رنگِ سحر کون لے گیا
اے نورؔ تیرے ذہن کے سوتوں کو کیا ہوا
سوز و گداز قلب و جگر کون لے گیا

(5)

درد کی تفصیل میرے پاس ہے
آنسوؤں کی جھیل میرے پاس ہے
رات کے تنہا مسافر سے کہو
فالتو قندیل میرے پاس ہے
چلچلاتی دھوپ کا عادی ہوں میں
پھر ہوس کی چیل میرے پاس ہے
زہر کے تریاق سے واقف ہوں میں
ناخلف زنبیل میرے پاس ہے
نورؔ کے دیمک زدہ تابوت کی
آخری وہ کیل میرے پاس ہے

ساجدؔ حمید

رابطہ پھر فلک سے ٹوٹ گیا
پھر زمیں تر لہو سے ہونے لگی

غزلیں

ساجدؔ حمید

(۱)

زندگی کے مسئلے حل ہو گئے
یعنی سارے لوگ پاگل ہو گئے

چار چھ پڑھ لیں کتابیں اور ہم
یہ سمجھ بیٹھے کہ صیقل ہو گئے

رات کی خوشبو کا جب آنچل اُڑا
مخملی جذبات بیکل ہو گئے

جن پہ تھا تحریر صحراؤں کا نام
وہ مناظر سبز جنگل ہو گئے

دیکھ کر پیلی رُتوں کی ساحری
حوصلے ساجدؔ کے بھی شل ہو گئے

(2)

نیند میں ہوں پر جاگ رہا ہوں
خواب کے پیچھے بھاگ رہا ہوں
میرا سورج سے کیاناطہ
میں تو دیپک راگ رہا ہوں
تیری بس اک ہاں کی خاطر
دشت و صحرا تیاگ رہا ہوں
جس سے مصفا دھڑکن ہو جائے
ایسی شیتل آگ رہا ہوں
گھیر رہی ہے دنیا ساجدؔ
کیا میں سچ مچ باگ رہا ہوں

(3)

سکوتِ جاں سکوڑ کر چلا گیا
وہ ساعتیں نچوڑ کر چلا گیا
بکھرتے رنگ زیست کے سمیٹ کر
مری نظر سے جوڑ کر چلا گیا
بچا رکھی تھی آبرو گناہ کی
تمام عکس توڑ کر چلا گیا
ٹپک نہ پائی تھی قلم سے چاندنی
رخِ نشاط موڑ کر چلا گیا
حمیدؔ صبح کا بجھا جلا نہ تھا
کنارِ شب وہ چھوڑ کر چلا گیا

(4)

روح کو پہلے خاکسار کیا
پھر بدن میں نے تار تار کیا
در و دیوار سوچتے ہوں گے
سورجوں پر کیوں اعتبار کیا
انگلیاں اُٹھتے اُٹھتے کرنے لگیں
ہم نے جب آسمان پار کیا
رایگاں ہو رہی تھی تنہائی
تیری یادوں کا کاروبار کیا
لوگ کتنے بچھڑ گئے ساجدؔ
خودکو جب ہم نے بے حصار کیا

(5)

روح کا زخم کسمسائے ہے
کون دل کے قریب آئے ہے
درد اتنا بھی تھا کہاں مدھم
چاندنی نیر کیوں بہائے ہے
پھر لہو میں ستار بجنے لگا
پھر نیا خواب گدگدائے ہے
آہٹوں کا گمان ہے شاید
کنجِ تنہائی مسکرائے ہے
گر گیا آسماں سمندر میں
کیازمیں اور ظلم ڈھائے ہے

حشمتؔ فاتحہ خوانی

جس کو کہتے ہیں اک تصور ہم
وہ پرندہ اُڑان میں رکھنا

غزلیں

حشمتؔ فاتحہ خوانی

(۱)

خوابوں کا سلسلہ نہ خیالِ غبار اب
یعنی ہمارے بس میں کہاں انتشار اب

یہ شہر بھی ہے یا کہ کوئی آزمودہ خواب
تنہا لگے ہے بھیڑ میں اپنا شمار اب

تعبیر کیا بتائے گی نیندوں کی تشنگی
آموختہ پھر سے یاد کرو بار بار اب

ایسی ہی کوئی بات تھی دونوں کے درمیاں
لگتا تھا جیسے دو ہی رہے ہوشیار اب

حشمتؔ پڑی ہے کس کو ضرورت کہ جا ملے
کرتا ہے کون شہر میں اپنا شمار اب

(2)

بستی میں چلتے چلتے بہت شام کر گیا
رستے میں چاند رات کا کہرام کر گیا
دل کی زباں لہو کی خموشی کا کیا جواز
اظہارِ دلبری تیرا ابہام کر گیا
نیندوں کی تشنگی تھی یہ خوابوں کی آرزو
یہ کون مجھ کو واقفِ آلام کر گیا
نیندوں میں جاگ جاگ اُٹھے رات رات بھر
اتنا تو شہر میں کوئی بد نام کر گیا
کس سمت کس شمار کریں عمر رایگاں
دریا لکھا نہ موج لب ِ نام کر گیا

(3)

پیاس بجھتی گئی
تشنگی نہ بجھی
رات کٹتی نہیں
ہجر کی ہے گھڑی
آسماں پھٹ پڑا
کیا تباہی مچی
دن تو اچھا کٹا
رات کیسی کٹی
کیسی حشمتؔ غزل
خامہ فرسائی کی

(4)

کس کو معلوم واقعہ گل کا
حادثہ ہی عجیب تھا دل کا
زیست ساری سمٹ گئی جس میں
ایک لمحہ بھی بوجھ تھا دل کا
لوٹ کر پھر نہیں وہ آئے گا
ہے عبث انتظار ساحل کا
ہلکی ہلکی خلش ہے موجوں میں
دھندلا دھندلا ہے خواب ساحل کا
ڈوبتی شام اور یادیں تھیں
زخم گہرا ہوا مرے دل کا

(5)

عجب سلسلہ چل پڑا گفتگو کا
مرے روبرو ایک عالم تھا ہو کا
پرندے اُڑانے کا فن جانتا ہے
وہ دیکھو کھڑا ہے وہ کیسے بجو کا
مجھے کیا پتہ تھا جدا ہو گا اتنا
ہری شاخ پر گل کھلا آرزو کا
قد و خال میں تھا بڑا تھا مجھ سے لیکن
سلیقہ نہ تھا بات میں گفتگو کا
کئی آبلے ہیں جو تلوؤں میں روشن
ہر اک آئنہ ہے مری جستجو کا

سلیمؔ محی الدین

ہمارے بیچ ہے نسلوں کی دوری
مگر اک رابطہ ٹوٹا نہیں ہے

غزلیں

سلیمؔ محی الدین

(۱)

دشت کی دھوپ بھر گیا مجھ میں
میرا سایہ بکھر گیا مجھ میں

نام ہو چاہے عکس ہو تیرا
اک جزیرہ اُبھر گیا مجھ میں

پڑھ سکا جو ورق نہ مجھے
وہ مکمل اُتر گیا مجھ میں

اس کو گزرے گزر گئیں صدیاں
ایک لمحہ ٹھہر گیا مجھ میں

قید تنہائی سے نکالے وہی
جو مجھے قید کر گیا مجھ میں

(2)

جھیل آنکھوں میں چاندنی جیسا
پھر وہی خواب ، زندگی جیسا
دل کی تاریکیوں کے پیچھے بھی
اک عقیدہ ہے روشنی جیسا
میں ہی کٹتا رہا کناروں سے
وہ گزرتا ہے اک ندی جیسا
کچھ تو ہے ڈارونِ میں سچائی
آدمی کب ہے آدمی جیسا
وہ اگر وہ نہیں تو آخر کیوں
دور سے پھر لگا اسی جیسا

(3)

کچھ سوچا کچھ لکھا جائے
یارو جنگل بڑھتا جائے
اپنے آپ کو ڈھونڈ رہاہوں
دروازے پر لکھا جائے
یخ بستہ جھیلوں سے بہتر
اپنے آپ میں ڈوبا جائے
ساتھ مرے کیوں خوش رہتی ہے
تنہائی سے پوچھا جائے
آوازوں کا رشتہ کوئی
سرگوشی سے جوڑا جائے

(4)

جس پل تجھے سوچا نہ تھا
مجھ میں مرا سایہ نہ تھا
سچ بول کر تنہا ہوا
یہ حادثہ پہلا نہ تھا
کیا ڈھونڈتے دھرتی پہ ہم
اپنا پتا ملتا نہ تھا
تھا دشمن جاں روبرو
الفاظ تھے لہجہ نہ تھا
دنیا ہے گر اس کی طرف
میں بھی کبھی تنہا نہ تھا

(5)

اک مسلسل اڑان میں رہنا
ہر نفس امتحان میں رہنا
زندگی سے کوئی تو رشتہ ہو
تیر ہونا ، کمان میں رہنا
پانیوں پر مکاں خدا رکھے
اے ہوا بادبان میں رہنا
تھام کر انگلیاں دعاؤں کی
زندگی کی امان میں رہنا
تیری دھرتی پہ ایسی تنہائی
ہے بھلا آسمان میں رہنا

مقبول احمد مقبولؔ

اک ایک سانس میں تیرا وجود ہے، لیکن
کہاں کہاں لیے پھرتی ہے گمرہی ہم کو

غزلیں

مقبول احمد مقبولؔ

(۱)

رفیقوں سے عبث میں بدگماں تھا
مرا دشمن ، مرے اندر نہاں تھا

مرے اطراف بارش قہقہوں کی
مری آنکھوں سے اک دریا رواں تھا

پرائی ہوگئی ہے اب زمیں بھی
کبھی میرے ہی حق میں آسماں تھا

خبر کیا تھی ، کہ تجھ سے جی لگانا
حقیقت میں مرے جی کا زیاں تھا

ریا کارِ ازل تھا در حقیقت
بظاہر ، وہ رفیق و رازداں تھا

(2)

فلک تھرا اُٹھے گا زلزلہ ساحل سے نکلے گا
اثر انگیز نالہ جب کسی کے دل سے نکلے گا
بٹھالے اپنے پہلو میں نہیں تو کیا غضب ڈھائے
اگر یہ تیرا دیوانہ بھری محفل سے نکلے گا
وہ عالم ہے کہ آنکھوں میں نہیں اک بوند بھی باقی
نہ ہی اب قطرۂ خوں تک ہمارے دل سے نکلے گا
نہ کوئی قیس جھلسے گا سلگتے ریگزاروں میں
نہ ہی اب چہرہ ٔ لیلیٰ کسی محمل سے نکلے گا
ابھی کچھ روز ٹھہریں گے کہ اک ارمان ہے باقی
چلے جائیں گے جب وہ بھی ہمارے دل سے نکلے گا

(3)

ہے ناز، بڑا ناز، کہ خوش بخت ہیں ہم بھی!
پایا ہے غمِ زیست بھی، محبوب کا غم بھی!
خاموش اگر ہیں، تو یہ ہے ظرف ہمارا
میدان میں آجائیں تو کچھ کم نہیں ہم بھی
منزل کی لگن ہو تو ہیں رستے بڑے آسان
بے فائدہ ہیں ورنہ یہ سب نقش قدم بھی
قانع کو ہے مٹی کا پیالہ ہی بڑی چیز
طامع کے لیے کم ہے بہت ساغرِ جم بھی
کیا کیا نہ سنا آپ نے پھر بھی ہے گزارش!
سنیے کبھی مقبولؔ کی رودادِ الم بھی

(4)

ظالم کی جفاؤں کو ادا کس نے کہا ہے
مسموم ہواؤں کو صبا کس نے کہا ہے
جس شہر کے بازار میں بکتے ہیں فقط غم
ملتی ہے وہاں غم کی دوا کس نے کہا ہے
کیا دورِ جفا کیش ہے؟ سب اہلِ غرض ہیں
ہے عام بہت جنسِ وفا کس نے کہا ہے
وہ شعر ہو، یا فلسفہ یا فکر و تخیل
ہوتے ہیں سبھی راہ نما کس نے کہا ہے
بھارت کی رواداری تو بے مثل ہے مقبولؔ
مجرم یہاں پاتے ہیں سزا کس نے کہا ہے

(5)

جن پر تھا گماں یہ کہ وہ سالار بڑے ہیں
معلوم ہوا اب، کہ اداکار بڑے ہیں
کشکول لیے پھرتے ہیں در در پہ شب و روز
پھر شان سے کہتے ہیں کہ خوددار بڑے ہیں
یہ راز کھلا اب کہ ہیں تہذیب سے عاری
ہم جن کو سمجھتے تھے طرح دار بڑے ہیں
دو گھونٹ ہی میں ہوگئے وہ آپے سے باہر
ہم نے جنھیں سمجھا تھا، قدح خوار بڑے ہیں
مقبولؔ! ہوئے چور بس اک ضربِ الم سے
دعویٰ یہ تھا جن کا کہ وہ جی دار بڑے ہیں

اقبال خسرو قادری

ہر صبح شاہ رگ پہ ملے ناخنی نقوش
خوں تشنہ روح خواب گراں میں کوئی تو ہے

غزلیں

اقبال خسرو قادری

(۱)

مکمل سب ادھورا کرتے رہنا ہے
غلط بردار، کا لا کرتے رہنا ہے

بہ صد تکریم دنیا نے خوشامد کی
بہ صد اکراہ دنیا کرتے رہنا ہے

اسی آغوش میں ہے موت کا پہلو
اسی زانو پہ تکیہ کرتے رہنا ہے

اب اس سے بھی زیادہ طاقت رم کیا؟
اسی حجرے کو صحرا کرتے رہنا ہے

مسائل کا فلیتہ خاک ہونے تک
جلالی نقش کھینچا کرتے رہنا ہے

(2)

ذرا سی ٹیڑھ بھی رکھتا نظر نہیں آتا
میاں! تو اپنی طرف کا نظر نہیں آتا
یہاں سے کھولتا ہوں خوابِ نیم روز کا باب
یہاں سے درد کا چہرہ نظر نہیں آتا
عجیب جنتِ احساس کا مقیم ہے دل
کہیں بدن سے علاقہ نظر نہیں آتا
بلا سے جان لے، چٹکی نمک عطا کر دے!
وہ ظالم ، ایسا فرشتہ نظر نہیں آتا
زمانے ہو گئے تجھ کو سنے ہوئے خسروؔ!
غزل کا جسم پگھلتا نظر نہیں آتا

(3)

کیسے ہو میری جان ! پوچھتا ہے
دوگزی اک مکان ، پوچھتا ہے
قیمتاً داخل نسب ہر نام
ہم سے نام و نشان پوچھتا ہے
کیسے ٹھوکر لگی مرے بچے ؟
پیار سے آسمان پوچھتا ہے
بھوک کے کشکول کا نسب نامہ
پارۂ خشک نان پوچھتا ہے
کیوں یہ عجلت ہے؟ سنبھلو! بات سنو!
پاؤں سے پائدان پوچھتا ہے

(4)

صلح مشرب ، کینہ پرور جانتے ہیں
سب کو ہم اپنے برابر جانتے ہیں
اپنی مرضی ، قید ہیں دشت بدن میں
گھر کا رستہ تم سے بہتر جانتے ہیں
چھوڑیے ! کس کس سے سر ٹکرائیے گا؟
پتھروں کا کرب ، پتھر جانتے ہیں
چاند ہے کشکول بوڑھے آسماں کا
کوچۂ شب کے قلندر جانتے ہیں
شاعری تو خیر! باب بادہ نوشی
اپنے تئیں غالب سے بڑھ کر جانتے ہیں

(5)

لحد لحد تک حساب دنیا بچا ہوا ہے
ہوئے تو ہیں کامیاب ، پرچہ بچا ہوا ہے
اسے کریں فون ، یا کسی کی دعائیں لیں ہم
یہ آخری روپے کا سکہ بچا ہوا ہے
اسی بہانے غریب کی شب مہک اُٹھے گی
چنگیر میں آج ایک گجرا بچا ہوا ہے
شکست بھی جیت ہے تو اپنی شکست ہی کی
بچا ہوا کچھ ، تو یہ سلیقہ بچا ہوا ہے
یقیں جب آئے کہ ہاں! نہیں بھی نہیں بچے گا
تو غور فرمائیں گے کہ کیا کیا بچا ہوا ہے ؟

سردار سلیمؔ

ذرا سی بے خودی لازم ہے زندہ رہنے کو
ہم اتنا جاگ گئے ہیں کہ ڈر سا لگتا ہے

غزلیں

سردار سلیمؔ

(۱)

لے کے گہنائی ہوئی ذات کدھر جاتے ہو
ٹھہرو لمبی ہے بہت رات کدھر جاتے ہو

اپنی تنہائی ملا دو مری تنہائی میں
بیٹھو کچھ دیر مرے ساتھ کدھر جاتے ہو

دل تو کھنچتا ہے بہت کوچۂ جاناں کی طرف
ذہن سے لپٹے ہیں خدشات کدھر جاتے ہو

لفظ تہذیب غزل سے متصادم ہوں اگر
چیخ اُٹھتے ہیں خیالات کدھر جاتے ہو

سر میں سودا ہے زمانے پہ حکومت کا سلیمؔ
دسترس میں نہیں لمحات کدھر جاتے ہو

(2)

قلم دوات سے آگے کمال چلتا رہا
زبان تھک گئی لیکن خیال چلتا رہا
شعاعیں ملگجی ہوتی گئیں چراغوں سے
جواب جیب میں رکھ کر سوال چلتا رہا
ہوس ہرن کی طرح بھر رہی تھی چوکڑیاں
ضمیر مست قلندر چال چلتا رہا
ڈگر ڈگر پہ ملیں جھوٹ موٹ کی خوشیاں
مگر دکھوں کا سفر حسب حال چلتا رہا
مرے ہیں کتنے گھروں میں کرائے دار کی موت
ہمارا مشغلہ ٔ انتقال چلتا رہا

(3)

دیکھ اشکوں کی روانی پھر سے
سر سے اونچا نہ ہو پانی پھر سے
رتجگا میں بھی مکمل کرلوں
تم بھی دہراؤ کہانی پھر سے
بجھ گئے ہیں مرے زخموں کے چراغ
دے کوئی تازہ نشانی پھر سے
شاخ پر ایک نیا پھول کھلا
مہکی اک یاد پرانی پھر سے
نیم مردہ مرے خوابوں نے سلیمؔ
زندہ رہنے کی ہے ٹھانی پھر سے

(4)

دن بھر کی تھکن جوڑ کے رومال پہ رکھ دوں
مٹی سے سنے ہاتھ ترے گال پہ رکھ دوں
ناخن سے تراشا تھا جہاں تو نے میرا نام
اک خواب سا لمحہ میں اسی ڈال پہ رکھ دوں
زلفوں سے تر ی فال گھٹاؤں کا نکالوں
اور نام ستاروں کا تر ی چال پہ رکھ دوں
ہر چیخ کو نغمے کی طرح کردوں ملائم
سسکی کی صداؤں کو بھی سر تال پہ رکھ دوں
اچھی نہیں الفت میں سلیمؔ اتنی گراوٹ
اظہار تمنا کو میں چونچال پہ رکھ دوں

(5)

صعوبتوں کی وہ پوشاک ہو کے رہنی تھی
قبائے جاں، جو بصد شوق میں نے پہنی تھی
ہے آج چرچا اسی بات کا زمانے میں
جو بات مجھ کو اکیلے میں تم سے کہنی تھی
نہ مسکراتا اگر میں تو اور کیا کرتا
بہ شرط عشق ہر اک چوٹ ہنس کے سہنی تھی
ترا بچھڑنا یقیناً مشیت حق ہے
کہ دشت ہجر میں یادوں کی نہر بہنی تھی
عبث ہے تیری مسیحائی میرے دل کے لیے
جو تیری دی ہوئی تکلیف تھی وہ ذہنی تھی

واجد اختر صدیقی

طاق نسیاں میں رکھ دی کتابِ وفا
دیکھتا کون ہے کھولتا کون ہے

غزلیں

واجد اختر صدیقی

(۱)

رفاقتوں کا مری اور کیا صلہ دے گا
مرے خلوص کو وہ رنگ دوسرا دے گا

تھکن سے چور ہیں سب زندگی کی راہوں پر
سفر گراں ہے کسے کون حوصلہ دے گا

عجیب شخص ہے سادہ ہے یا کہ گہرا ہے
جہاں پہ کہنا ضروری ہے مسکرا دے گا

کھلی کتاب ہوں میں تجھ میں جستجو ہی نہیں
مرا ہی نقشِ قدم خود مرا پتہ دے گا

ہر اک کے باب میں رکھتا ہے حسنِ ظن اختر
عیاں کرے گا ہنر عیب کو چھپا دے گا

(2)

آندھی تھی ایسی ظلم کی کہ دل دہل گئے
شعلے بھڑک اُٹھے کہیں خنجر مچل گئے
یہ عزم تھا کہ رونے سے کرتے رہے گریز
اک وقت ایسا آیا کہ آنسو نکل گئے
منزل کی جستجو میں بھٹکتے ہی رہ گئے
رستے بدل گئے کبھی رہبر بدل گئے
کس درجہ جاں گسل ہے انساں کی سنگ دلی
میری کہانی سن کے تو پتھر پگھل گئے
اخترؔ کے پاس آج بھی باقی ہے سادگی
لیکن یہ لوگ شہر کے کتنے بدل گئے

(3)

دل کہہ رہا ہے بھول جا یادوں میں کچھ نہیں
تعبیر اصل چیز ہے خوابوں میں کچھ نہیں
اخلاص وفا پیار تو ملتا ہے ان کے پاس
قصے کہانیاں ہیں کتابوں میں کچھ نہیں
چہرے پہ تازگی ہے بدن میں مہک ترے
اب کے برس تو کھلتے گلابوں میں کچھ نہیں
دھوکہ ہے اک فریب ہے چہرہ نہیں اصل
کیا ڈھونڈتے ہیں آپ نقابوں میں کچھ نہیں
یوں تو ہر اک سوال کا اخترؔ ہے اک جواب
بس التوا ہے ان کے جوابوں میں کچھ نہیں

(4)

یہ دنیا ہے فانی یہ دنیا ہے فانی
عجب زندگانی عجب زندگانی
بوڑھاپے میں احساس یہ ہو رہا ہے
گناہوں میں کاٹی ہے ساری جوانی
کہو سچ تو دار و رسن پر چڑھو
کہو جھوٹ آساں ہے یہ زندگانی
یہاں سب کا انجام ہے ایک سا
ہوئی ختم اک روز سب کی کہانی
تمدن و تہذیب کو ڈھایئے گا
عمارت ہوئی ہے یہ اخترؔ پرانی

(5)

کیسے کہوں کہ پیار نہیں
اقرار بھی ہے اقرار نہیں
امن و اماں کی راہ چلو
رستے یہ پر خار نہیں
راہ وفا میں کٹنے کو
اب کوئی تیار نہیں
کام بہت سے آپ کو ہیں
ہم بھی تو بے کار نہیں
سودے بازی کیوں اخترؔ
پیار ہے یہ بیوپار نہیں

مجتبیٰ نجمؔ

روز مرتے ہیں زندگی میں ہم
اُس معیّن قضا سے کیا مطلب

غزلیں

مجتبیٰ نجمؔ

(۱)

چاہیے نام ، زر نہ مال مجھے
مفلسی نے کیا نہال مجھے

جس کا مطلب نہیں ،جواب نہیں
پوچھتے ہیں وہی سوال مجھے

ہٹ گیا میں جو اپنے مرکز سے
کر نہ پایا کوئی بحال مجھے

یاں تو چہرہ شناس کوئی نہیں
خود ہی کرنا ہے عرض حال مجھے

غیر آئے مزاج پرسی کو
پوچھا اپنوں نے خال خال مجھے

(2)

لگتا ہے چارہ گر بھی سیاست میں کھو گیا
مرہم لگانے آیا تھا ، نشتر چبھو گیا
میں نے سفر کا عزم کیا اور چل پڑا
مشکل جو راستہ تھا وہ آسان ہوگیا
بیتے حسین لمحوں میں کھویا میں جب کبھی
احساس تازہ ہوگیا ، پلکیں بھگو گیا
جس سے مجھے رہی ہے سدا خیر کی امید
وہ شخص زندگی میں مری خار بو گیا
منظر لہو لہان ہے آنکھوں کے سامنے
احساس پھر بھی کیوں بھلا مفلوج ہوگیا

(3)

زندگی جب بھی مسکراتی ہے
کوئی پیغام چھوڑ جاتی ہے
دشمنی بھی کبھی کبھی یارو!
دوستی کا سبق سکھاتی ہے
بھیڑ میں بھی رہوں اکیلا سا
مجھ کو تنہائی راس آتی ہے
گو تبسم ہے زیر لب رقصاں
آنکھ آنسو مگر بہاتی ہے
ایک نقطہ ہوں نجمؔ روشن سا
تیرگی مجھ سے خوف کھاتی ہے

(4)

ہے مال مگر جذبۂ خیرات کہاں ہے
اپنوں کے لیے آج یہی بات گراں ہے
اس دور میں اخلاص کے ہیں پھول ندارد
کاغذ کے حسیں گل کی بھی سوغات کہاں ہے
سر دُھنتے گیت پہ کیوں وصل کے مارے
اس میں تو فقط وصل کی ہی بات عیاں ہے
جس دن پہ کبھی فخر تھا، جو ناز تھا شب پر
وہ دن ہے کہاں امن کا، وہ رات کہاں ہے
گفتار سے بھی نجمؔ سنور جائے گی دنیا
کردارِ حقیقت بھی اگر ساتھ رواں ہے

(5)

تھا جو احساس ،مر گیا ہے کیا؟
سلسلہ سوچ کا تھما ہے کیا؟
مسکراتا ہے وہ شجر عریاں
کوئی پتہ ابھی ہرا ہے کیا؟
دشمنِ جان کرے نچھاور گل
پیچھے مقتل کوئی سجا ہے کیا؟
آئنہ گھورنے لگا مجھ کو
آج چہرے پہ کچھ نیا ہے کیا
نجمؔ! ناشکرے لوگ کہتے ہیں
ایسی دنیا میں اب رکھا ہے کیا